نگار

قواعد رسالہ "نگار"

۱ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے
۲ رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا
۳ خط کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے - جنپر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضایع کر دئے جاتے ہیں
۴ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے
۵ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہیئے
۶ سالانہ قیمت پانچ روپیہ - ششماہی تین روپیہ - بیرون ہند سات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

نرخنامہ اجرت اشتہارات

تعداد صفحہ	یک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۲ روپیہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۰ روپیہ	۱۲ روپیہ
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۸ روپیہ	۵ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دیں گے اُن کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا (۳) میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے

نگار بُک ایجنسی لکھنؤ

نگارستان

(دوسرا اڈیشن)
حضرت نیاز کے ادبی متعدد مضامین اور افسانے شامل کئے گئے ہیں نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے -
قیمت ...... عہ

گہوارۂ تمدن

(دوسرا اڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جسمیں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیائے تہذیب و شائستگی اسکی کس قدر ممنون ہے - اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے، قیمت علاوہ محصول عہ

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے - اس زبان کی اسکی تخئیل اسکی نزاکت بیان، اسکی بلندی مضمون و اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچی ہے قیمت علاوہ محصول عہ

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص با سانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت عروج و زوال موت و حیات صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے قیمت علاوہ محصول عہ

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام لذت بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں - علاوہ محصول ۱۰/

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک بسیط مقدمہ کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کئے ہیں انکی ایسی تشریح کی ہے کہ اصل کتاب ہو جاتا ہے قیمت علاوہ محصول ۱۲/

صحابیات

جسمیں عہد رسالت کی ۵۰ خواتین کے مستند حالات لکھے گئے ہیں اسکا مقدمہ مولانا نیاز نے خاص اہتمام سے لکھا ہے، قیمت علاوہ محصول ۸/

تذکرۂ غنچۂ گل

مولفہ عبد الباری آسی جسمیں ۳۰۰ سے زائد فارسی کے ظریف شعراء کے حالات مع انکے لطائف و ظرائف و انتخاب کلام کے درج ہیں قیمت محصول ۲/

حضرت ریاض خیرآبادی
یکم جنوری ۳۱ء

بسم اللہ

نگار

جلد ۱۹ فہرست مضامین ماہ فروری سنہ ۱۹۳۱ء شمارہ ۲

ملاحظات ۔۔۔۔۔۔ ۲

صنف نازک کی حکومت کا دور اول ۔ ۹

جھوٹ ظفر قریشی ۔۔۔۔۔۔ ۲۴

حضرت ریاض آپ اپنے آئینہ میں (حضرت ضیا) ۳۱

جسم کیلئے خانونکی اہمیت (شمعون احمد) ۴۷

روپ کا نشہ (ڈاکٹر اعظم کریوی) ۵۶

نوادر ادب (مرزا نوشہ "غالب") ۶۰

خیام کے چند اچھوتے جام (خان امتیاز علی عرشی) ۶۷

نولکشور پریس کی ریڈریں ۔۔۔۔۔۔ ۶۹

مطبوعات موصولہ ۔۔۔۔۔۔ ۷۳

باب الاستفسار ۔۔۔۔۔۔ ۸۱

سفینہ کاغذیں (نظم) خان امتیاز علی عرشی ۸۴

پیام زندگی (نظم) علی اختر۔ اختر ۸۶

قبائے رنگیں (نظم) بسمل قاضی پوری ۸۹

نالۂ سحری (طالب باغپتی) ۹۰

رباعیات آسی (جناب آسی) ۹۱

غزلیات مختلف حضرات ۔۔۔۔۔۔ ۹۲

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۱۹ فروری سنہ ۱۹۳۱ء شمار (۲)

ملاحظات

گزشتہ ماہ کی مصروفیت اور نگار کے صفحات کی تنگی نے اس کی بھی اجازت نہ دی کہ میں شائع شدہ مضامین کے متعلق کوئی تحریر بطور تعارف یا تقریب پیش کر سکتا۔ اس ماہ کی اشاعت میں ملاحظات کو وہیں سے شروع کرتا ہوں۔

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں پہلا مضمون فراست التحریر پر جناب یاسین ہاشمی ایم۔اے کا ہے جنھوں نے عرصہ تک اس فن کا مطالعہ کیا ہے۔ ہر چند یہ مضمون اس قدر مکمل و مفصل نہیں ہے کہ ایک متعلم کے تمام مشکلات اس سے حل ہو جائیں، لیکن جو کچھ اصولاً بیان کر دیا گیا ہے وہ ضرور اس حد تک کافی ہے کہ ایک شخص ان پر کاربند ہو کر خود نتائج تک پہونچنے کا اہل ہو سکتا ہے۔ جب جنوری کا پرچہ مکمل ہو چکا تو مینے محسوس کیا کہ اگر انگریزی رسم خط کے متعلق بھی اس فن کے اصول کی مثالیں دیکر واضح کر دیا جاتا تو بہتر ہوتا کیونکہ انگریزی زبان کی مقبولیت کا اقتضاء یہی تھا اور اسی بنا پر میں نے اعلان کر دیا تھا کہ فروری کے نگار (یعنی اس اشاعت میں) اس کو بھی شائع کر دیا جائے گا۔ لیکن چونکہ وہ بھی کم وبیش اتنی ہی ضخامت کا ہو گیا ہے جتنا اردو فراست التحریر کا مضمون ہے، اس لئے مناسب یہی معلوم ہوا کہ اس کو علیحدہ چھپوا کر ان دونوں کو باہم ملا دیا جائے اور کتابی

صورت میں پیش کردیا جائے تاکہ لوگوں کو مطالعہ واخذ نتائج میں سہولت ہو۔ امید کیجاتی ہے کہ اپریل کے اخیر تک یہ کتاب طبع ہو کر شائع ہو جائے گی۔

جو فسانہ "داستان حسن وعشق" کے عنوان سے شائع ہوا ہے وہ میرا طبع زاد نہیں ہے بلکہ تھیوفائل گاٹئر (THEOPHILE GAUITER) کے فسانہ "قلو بطرہ کی ایک رات" (ONE OF CLEOPATRA'S NIGHT) سے بہت کچھ حذف واضافہ کے بعد لیا گیا ہے۔

"علمائے کرام کا نظریۂ دینی" عرصہ سے ملتوی ہوتا چلا آرہا تھا اس لئے جنوری میں اس کو شائع کردیا گیا۔ اور آخرکار وہ خلش دور ہو گئی جو اس مجموعۂ فتاوے کی عدم اشاعت سے میرے دل کو بے چین بنائے ہوئے تھی۔

اخیر میں خواب وخیال کے عنوان سے جو فسانہ جناب مجنوں گورکھپوری کا شائع ہوا ہے۔ وہ اُن کے گزشتہ افسانوں کے لحاظ سے یقیناً فروتر ہے، اور سوائے اس کے کہ اس میں فسانہ نویسی سے متعلق حقیقت نگاری کی طرف زیادہ توجہ کی گئی ہے اور کوئی خاص بات نہیں ہے، البتہ اُن کا وہ متشائم رنگ جس میں جوش محبت کے ساتھ الجھن، مایوسی، سردولی، صبر وضبط وغیرہ سب کچھ ملا ہوتا ہے۔ ضرور اسمیں بھی نمایاں ہے۔

بعض احباب نے اسکے پلاٹ کو مخرب اخلاق اور شرمناک ظاہر کیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں جن کے یہاں بہت سے اصول اخلاق کی بنیاد، ہندوؤں کے اصول معاشرت اور اُن کے رسم ورواج پر قائم ہوئی ہے، اس خیال کا پیدا ہونا مستبعد نہیں ہے، لیکن اگر محض حقیقت کی نگاہ سے اس پلاٹ کے امکان پر غور کیا جائے تو اس میں بھی صرف وہی باتیں مخرب اخلاق رہجاتی ہیں جو تمام عشقیہ فسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ محض اس فسانہ کو خصوصیت کے ساتھ ایسا کہنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ علاوہ اس کے اگر تنقید کے اس اصول پر غور کیا جائے کہ "ایک مضمون اچھا لکھا ہوتا ہے یا بُرا اخلاقی یا غیر اخلاقی کچھ نہیں" تو پھر اس نقطۂ نظر سے دنیا کی کسی کتاب کو مخرب اخلاق نہیں کہہ سکتے۔ اگر اُس سے مقصود واقعی اخلاق کی تعلیم دینا نہیں ہے۔

جنوری کا نگار شائع ہو چکا تھا کہ مولانا محمد علی کے واقعۂ ارتحال کی خبر ہندوستان آئی۔ صبح کا وقت تھا، میں بیٹھا ہوا بعض ضروری خطوط کا جواب لکھ رہا تھا کہ میرے کانوں میں یہ صدا آئی اور میں وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مولانا محمد علی کیا چیز تھے۔ کن خصوصیات کے حامل تھے۔ انھوں نے ملک وقوم کی کس قدر گرانمایہ خدمات انجام دیں۔ ان سب کا علم اخبارات کے ذریعہ سے ان لوگوں کو بھی ہو چکا ہے جو ان سے واقف

نہ تھے - اس لئے میں ان کا اعادہ وتکرار مناسب نہیں سمجھتا، اور یہ سطریں محض اس صدمہ کے اظہار میں لکھ رہا ہوں جو اس فقدان عظیم کی وجہ سے نہ صرف اسلامی ہند بلکہ سارے ہندوستان کو پہونچا ہے - مولانا محمد علی کی صحافی ورہنمایانہ زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرا جسے ہندوستانی سیاسیات کے تار وپود سے علیحدہ کیا جا سکے - وہ ایثار وقربانی، حریت رائے، آزادی فکر، قوت عمل، اور حب قوم کا مجسمہ تھے - اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ ثبوت ان کی وطن پرستی کا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسی جذبہ کے ماتحت آخرکار اُنھوں نے جان ہی دیدی -

اس میں شک نہیں کہ ہمیں ان کے بعض اصول کار سے اختلاف تھا اور ہمکو یقین ہے کہ اگر وہ اپنی بعض کمزوریوں کی وجہ سے (جن سے کوئی انسان خالی نہیں) اپنے جادۂ اولین سے انحراف نہ کرتے تو وہ ملک وقوم کے لئے بہت زیادہ مفید ثابت ہوتے، لیکن اُنکے خلوص وصداقت کو ایک لمحہ کیلئے بھی مشتبہ قرار نہیں دیا جا سکتا - اور اس لئے اگر اُن سے کوئی غلطی بھی ہوئی ہو تو ایک مجتہد کی غلطی کی طرح ثواب سے خالی نہیں ہو سکتی -

مولانا مرحوم کی صحت وتندرستی ایک زمانہ سے خراب تھی اور اُن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ موت سے قریب تر ہوتے جارہے ہیں، لیکن اُنکے مردانہ عزائم اور دلیرانہ جوش عمل میں کبھی کوئی لغزش پیدا نہیں ہوئی، اور اپنی صحت وتوانائی یا راحت وآسائش کی طرف فرض کی حد تک بھی کبھی توجہ نہیں ہوئی - اس لئے اگر یہ دعوی کیا جائے کہ وہ مسلمانوں کی جماعت میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتے تھے تو غالباً بیجا نہ ہوگا اور اس لئے ہندوستان اس فقدان کے ساتھ اس صدمہ کو بھی کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ وطن پر فدا ہوجانیوالی ہستی کی خاک سے بھی وطن کو محروم رکھا گیا - یہ درست ہے کہ اعتقادی نقطۂ نظر سے بیت المقدس ان کے لئے بہترین آرامگاہ ہو لیکن ہمیں اس کے ماننے میں تامل ہے کہ اُنھوں نے خود وصیت یہی کی تھی، یا تو ان کو وہیں یورپ میں دفن ہونا چاہئیے تھا تاکہ وہاں آزادی ہند کی ایک یادگار قائم ہوتی یا پھر آغوش ہند میں ان کی مٹی کو سپرد کرنا چاہئیے تھا، جس کے لئے اُنھوں نے جان دی -

خیر وہ تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا - اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سی یادگار ہو سکتی ہے، جسکو صحیح معنے میں مرحوم سے منسوب کیا جا سکے، اور اس کے قیام کے لئے ملک کس حد تک طیار ہے - ابھی تک اجتماعی حیثیت سے کوئی فیصلہ اس امر کا نہیں کیا گیا اور اس لئے ابھی رائے زنی کا وقت نہیں ہے، لیکن جہاں تک ہماری خواہش کا تعلق ہے، ہم اس یادگار کا قیام مادی وروحانی دونوں طریق پر دیکھنا چاہتے ہیں، روحانی سے مراد کسی ایسی تحریک کی تاسیس ہے جو تربیت عقول واذہان کے لحاظ سے مرحوم کے مقصد زندگی کو پورا کرنے والی ہو -

اور مادی سے مقصود کوئی ایسی تعمیر ہے جو بصیرت کے علاوہ بصارت انسانی کو بھی ان کی یاد دلاتی رہے۔ امر اول کے لئے بہترین طریقہ یہ ہے کہ جامعہ ملیہ دہلی سے متعلق ایک کلیہ محمد علی کے نام سے قائم کیا جائے اور امر دوم کی نسبت میری رائے یہ ہے کہ اُسی کلیہ میں مرحوم کا ایک مجسمہ قائم کیا جائے۔ جامعہ ملیہ والے تو غالباً اس کو بخوشی قبول کرلیں گے، لیکن مولویوں کی طرف سے ضرور اندیشہ ہے کہ شاید وہ مجسمہ کے قیام کو جائز نہ سمجھیں بہرحال قیام یادگار کی جو صورت بھی تجویز کیجائے اس میں ان دونوں پہلوؤں کا لحاظ ہمارے نزدیک ضروری ہے۔ اس طرح نہ سہی کسی اور طرح سہی۔

ہندوستانی اکاڈمی اور اُسکے رسالۂ تماہی کے متعلق نگار میں جو اظہار خیال کیا گیا تھا وہ آخر کار بیکار ثابت نہ ہوا اور دسمبر سنہ ۳۰ء کے رسالۂ زمانہ میں انتہائی پیچ و تاب کے ساتھ (ہر دو منشی) دیانرائن نگم و پریم چند صاحبان نے دل کی بھڑاس نکال ہی لی۔

فریاد از تطاول مشکیں کمند تو!

ان دونوں حضرات نے جواب کا جو پہلو اختیار کیا ہے وہ خلاف توقع نہیں، میں یہ جانتا تھا کہ وہ اس بحث میں زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتے ہیں کہ صرف میری ذات کو اپنی "اردو دانی" کا ہدف قرار دیں اور خدا کا شکر ہے کہ اس طرح میرے وہ تمام اعتراضات اپنی جگہ ابتک قائم ہیں جنکا تعلق "اصول کار" سے ہے اور جس سے میرے ان دونوں دوستوں نے مطلقاً بحث نہیں کی۔

مینے ترقی اردو کے متعلق زبان کو سہل و دشوار بنانے پر اپنی رائے کا اظہار کیا لیکن اس کا کوئی جواب نہ دیا گیا مینے یہ دریافت کیا کہ گالسوردی کے ڈراموں کو اردو میں منتقل کرنیکے لئے کیوں کسی مسلمان کو تجویز نہ کیا گیا، اسکا جو جواب دیا گیا ہے اسمیں غلط بیانی سے بھی کام لیا گیا اور مغالطہ سے بھی۔ غلط بیانی تو یہ ہے کہ اس مسئلہ کا طے ہونا میری موجودگی میں ظاہر کیا ہے، جو بالکل خلاف حقیقت ہے اور مغالطہ یہ ہے کہ اس تجویز کو بغیر نام ظاہر کئے ہوئے ایک سر بستہ مسلم کیطرف منسوب کیا۔ درآنحالیکہ میرا کہنا یہ تھا کہ خود جناب نگم اور جناب رواں نے کیوں اس بار کو اپنے سر لیا۔ اسیطرح اور میرے بہت سے اعتراضات تھے جنکی طرف توجہ نہیں کی گئی۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں حضرات نے میرے مضمون کے صرف اس حصہ کو سامنے رکھ کر جواب دیا ہے جس میں انکی ادبیت یا اردو دانی کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ وہ اسکے جواب میں یہی کہہ سکتے تھے کہ "معترض خود نا معقول و نالائق ہے۔" لیکن میں نہایت ادب سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا میری نا اہلی ثابت کرنیکے بعد وہ اپنے آپ کو اہل ثابت کرسکتے ہیں۔ میں نے کبھی نہ اپنی ادبیت کا دعویٰ کیا اور نہ کسی علم و فضل سے منسوب کیا، بارہا میں نگار میں

ظاہر کرچکا ہوں کہ میری حیثیت صرف ایک طالب علم کی سی ہے اور مجھ میں کوئی خصوصیت قابل ذکر نہیں اسلئے میں حیران ہوں کہ ان دونوں حضرات نے میرے جہل کا ذکر کرکے مجھ پر کس جدید اکتشاف کا اظہار کیا اور وہ کونسی نئی بات اُنھوں نے بتائی جو مجھے یا دنیا کو معلوم نہ تھی۔

لفظ تماہی کے متعلق پروفیسر صدیقی کی تحریک کو سبب جواز قرار دیتے ہوئے جناب صدیقی کے علم و فضل اور ولایت جاکر اُنکے عربی ڈگری حاصل کرنیکا بیان ناحق کیا کیونکہ لندن کیا ایک شخص مکہ سے واپس آنے کے بعد بھی کسی خاص امتیاز کا مالک نہیں ہوسکتا اگر اس میں اہلیت نہیں ہے۔

میں اسکے ماننے کیلئے تیار ہوں کہ جناب صدیقی بہت فاضل شخص ہیں لیکن نہ اسوجہ سے کہ وہ لندن کی زیارت کرآئے ہیں، بلکہ صرف اسلئے کہ انکو زبانہ کی نبض شناسی کا کافی سلیقہ حاصل ہے اور وہ تجویز تماہی سے بھی زیادہ قوی ثبوت اپنی اس رمز شناسی کا دے سکتے ہیں۔

جناب نگم نے ایک جگہ یہ بھی فرمایا ہے کہ ترجمہ کا کام اگر کسی کو دیا جاتا تو ظاہر ہے کہ نظر انتخاب انٹرنس سے زیادہ انگریزی لیاقت رکھنے والوں ہی کیطرف اُٹھتی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ انٹرنس سے زیادہ قابلیت رکھنے والوں میں سوائے جناب نگم اور جناب رواں کے دوسرا کوئی ہو ہی نہ سکتا تھا۔ درآنحالیکہ حقیقت یہ ہے کہ محض قابلیت کا سوال ڈگری سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا اور اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ محض وسعت مطالعہ سے ایک شخص بڑی سی بڑی ڈگری رکھنے والے پر فوقیت رکھتا ہے۔

چونکہ جناب نگم اور پریم چند نے میرے ایک اعتراض کا بھی جواب نہیں دیا اس لئے مجھے بھی زیادہ تفصیل سے کام لینے کی ضرورت نہیں، لیکن مختصراً جناب پریم چند کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ باوجود اس ادعا کے کہ اُردو کو عربی فارسی الفاظ سے معرا کیا جاسکتا ہے اپنے تین صفحات کے مضمون کی ہر سطر میں تقریباً ۶-۷ الفاظ عربی فارسی کے انھوں نے استعمال کئے ہیں اور باوصف اس پندار کے کہ وہ اپنے آپکو اردو کا زبردست ادیب سمجھتے ہیں انھوں نے اپنے اس مختصر سے مقالہ میں ایک درجن سے زیادہ غلطیاں (الیسی) کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ باایں ہمہ کہنہ مشقی اب تک بہت سے عربی فارسی الفاظ کے صحیح مفہوم سے بھی آگاہ نہیں ہیں۔ اور یہیں سے میرے اُس اعتراض کی حقیقت واضح ہوجاتی ہے جو اس سے قبل کی اشاعتوں میں کیا گیا تھا۔

زمانہ کے اسی رسالہ میں جناب اثر لکھنوی کے ایک مضمون سے معلوم ہوا کہ منشی پریم چند نے آتش کی شاعری پر بھی علی الرغم جناب اثر کچھ اعتراضات وارد فرمائے ہیں۔ جناب اثر نے دو تین اعتراضوں کی عبارت بھی درج کی ہے جسکو دیکھنے کے بعد "اندکے طبیب ہم ہستم" کا لطیفہ یاد آگیا اور دیر تک اس سے میں لطف اندوز ہوتا رہا۔

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

رسالۂ زمانہ میں، جناب نگم نے مسٹر پریم چند کی اور پریم چند صاحب نے مسٹر نگم کی باہم دگر تعریف و ثنا کر کے جس خوبی کے ساتھ خدمت زبان اور زباندانی کو اپنے مخصوص دائرہ کے اندر محدود کر دیا ہے، اُس کی داد دینا یقیناً میرے اختیار سے باہر ہے۔ اسکا پورا لطف اگر کوئی اٹھا سکتا ہے تو وہ ڈاکٹر صدیقی ہیں جنھوں نے لفظ تماہی کی اختراع سے بہترین ماہر لسانیات ہونیکا ثبوت دیا ہے یا پھر وہ کوئی "مشہور مسلمان ادیب" ہو سکتا ہے جس کی شرکت میں پریم چند صاحب کا نولکشور کی اردو ریڈریں تیار کرنا ظاہر کیا جاتا ہے۔

جناب نگم نے میرے انداز تحریر پر اظہار غم و غصہ کرتے ہوئے یادش بخیر، ہمعصر سرفراز لکھنو کی بھی شہادت اپنی تائید میں پیش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ زمانہ کو سرفراز سے زیادہ معتبر شہادت میری مخالفت میں اور کس کی مل سکتی تھی۔ اور پھر کون ہے جو اس الہامی گواہی کے بعد مجھے قابل دار نہ قرار دیگا، لیکن میں پھر وہی عرض کرونگا جو ابھی کہہ چکا ہوں کہ سوال نہ میری نامعقولیت کا ہے اور نہ میری قابل نفرت طرز تحریر کا۔ بلکہ گفتگو تو اسمیں ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے جو نمونے اس زمانہ میں اردو کے پیش ہو رہے ہیں وہ کس حد تک قابل قبول ہیں۔ اگر نگاری اسکول (بقول سرفراز) کی روش کو پسند نہیں کیا جا سکتا تو سرفرازی اسکول کیا برا ہے۔ اسی کو اختیار کیا جائے مدعا تو صرف یہ ہے کہ بجائے عام فہم عربی فارسی الفاظ کے سنسکرت کے ثقیل الفاظ کیوں استعمال کئے جاتے ہیں، اور علمی و تنقیدی مضامین میں اگر عربی کے ثقیل الفاظ کہیں کہیں آجائیں تو انکو برداشت کرنا چاہئے جسطرح ہندی کے علمی مضامین میں سنسکرت کی اصطلاحات کا استعمال آزادی سے کیا جا رہا ہے۔ میرے اس سوال کے جواب میں اصل مسئلہ پر گفتگو کرنیکے بجائے صرف مجھے اور میری طرز تحریر کو برا کہدینا میں نہیں سمجھ سکتا کہ کس حد تک قرین سنجیدگی و انصاف ہے۔ اس گفتگو کا موقعہ تو اسوقت تھا جب میں کسی خاص طرز تحریر پر زور دیتا۔ میں نے تو ایک عام اُصولی گفتگو کی تھی اور اس کا جواب بھی اسی طرح اصولی ہونا چاہئے تھا۔ مجھے آپ لاکھ بار برا کہئے، میں برا نہیں مانتا کیونکہ حقیقتاً میں برا ہوں۔ لیکن خدا کیلئے وہ ترکیب مجھے بھی بتا دیجئے کہ دوسروں پر نکتہ چینی کرنے سے خود اپنا فضل و کمال کیونکر ثابت ہو سکتا ہے۔

اسی اُردو ہندی کے سلسلہ میں جناب افسر میرٹھی نے جو تجویز ہمعصر لیڈر میں شائع کی ہے وہ یقیناً بہت مناسب ہے۔ اب سے کئی ماہ قبل میں خود اس خیال کو ظاہر کر چکا ہوں کہ مسلمانوں کو ہندی زبان سیکھنا ضروری ہے اگر وہ چاہتے ہیں کہ ہندو اردو زبان کی اہمیت سے واقف ہوں۔ اگر سر رشتۂ تعلیم نے جناب افسر کی اس تجویز کو قابل عمل قرار دیکر ابتدائی و ثانوی مدارس میں اُردو ہندی دونوں کو ضروری قرار دیا تو یہ الجھنیں بڑی حد تک دور ہو سکتی ہیں۔ اور زبان کی سہولت و اشکال کا مسئلہ بھی بڑی حد تک صاف ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمکو معلوم ہے کہ جناب افسر کی یہ مبارک تحریک کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اور اسکی مخالفت کرنیوالے خویش و بیگانہ بہت سے پیدا ہو جائیں گے۔

میں نے اسی اشاعت میں کسی دوسری جگہ ایک مختصر مضمون کی صورت میں زیادہ وضاحت کے ساتھ ظاہر

کیا ہے کہ ہندو مصنفین اُردو کو کیا چیز بنا رہے ہیں اور پریم چند صاحب نے نولکشور پریس کو ریڈروں کو حسب ذہنیت کے ماتحت تیار کیا ہے وہ کیا بلا ہے؟

گزشتہ چند ماہ کے اندر جو جدید رسائل رونما ہوئے ہیں ان میں ایک سابق النعمد رسالہ حریم ہے۔ جو ہمیں لکھنؤ سے ہمارے عزیز دوست محمد نسیم انہونوی کے اہتمام اور ایک خاتون "آنسہ جمال" کی اڈیٹری میں شائع ہو رہا ہے۔ اس وقت تک اسکے دو پرچے نکل چکے ہیں، اور انکی ترتیب و تہذیب کو دیکھتے ہوئے ہر شخص بہ آسانی اس کے شاندار مستقبل پر حکم لگا سکتا ہے۔ کیا بہ لحاظ کتابت وطباعت، کیا بہ لحاظ انتقادیر و ترتیب، رسالہ نہایت پاکیزہ، دلکش اور مفید ہے۔ افسانے، نظمیں، معلومات، اور تدبیر منزل کے متعلق تمام مقالات اچھے ذوق اور سنجیدہ انتخاب کا ثبوت دیتے ہیں اور یقین کیا جاتا ہے کہ نہ صرف طبقۂ خواتین بلکہ طبقۂ رجال میں بھی یکساں دلچسپی کے ساتھ اسکا خیر مقدم کیا جائے گا۔ ہمارے نسیم صاحب چونکہ بہت محنتی اور مستقل مزاج انسان ہیں، اسلئے انکی کوششوں اور حوصلوں کو دیکھتے ہوئے اس رسالہ کے بقاء و تحفظ اور عروج و ترقی کے متعلق پیشین گوئی کرنا بے محل نہ ہوگا۔

دوسرا رسالہ یادش بخیر (ہندستانی) وہ تاہی جدیدہ ہے جو سرزمین ترہتی سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس کے متعلق ہم اپنی رائے ابھی محفوظ رکھتے ہیں۔ اگر ممکن ہوا تو ماہ آئندہ کی اشاعت میں ذرا البسط و تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا جائے گا۔

اس ماہ کے مضامین میں جناب شمون احمد صاحب بی۔ ایس۔ سی کا مضمون نہایت سخت قسم کا علمی مضمون ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر کب تک ہم کام کی باتوں سے احتراز کرتے رہیں گے۔

پہلا مضمون تاریخی و علمی دونوں حیثیات کا مالک ہے مگر مبحث کے لحاظ سے بہت دلچسپ نظر آئے گا۔ حضرت ریاض کے خود نگاشتہ سوانح حیات کے متعلق لکھنا بیکار ہے کیونکہ اسکی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ جناب اعظم کریوی کا افسانہ بھی خاص انکے رنگ انتخاب کا ہے۔ نولکشور پریس کی ریڈروں کے متعلق جو لکھا گیا ہے، اس پر تمام اُردو کے صحافیوں اور اہل مطابع کو توجہ کر کے کوشش کرنا چاہئیے کہ محکمۂ تعلیمات اس طرف متوجہ ہو۔ اور ایسی کتابوں کو نصاب سے خارج کر دے۔ نظم کے حصہ میں جناب مولوی علی اختر صاحب کی نظم اور ان کی غزلیں ایسی پاکیزہ چیزیں ہیں کہ وہ آپ اپنی داد حاصل کرنیکی ذمہ دار ہیں۔ میں کیوں لکھوں، اور کیا لکھوں؟

نیاز

صنفِ نازک کی حکومت کا دورِ اول

انسانی تاریخ کا ایک گمشدہ ورق

اصول تاریخ میں "تاریخی تکرار" سے زیادہ کوئی دلچسپ مسئلہ نہیں۔ دنیا کی گردش کے ساتھ ساتھ دنیا کے واقعات بھی گردش کرتے ہیں۔ یعنی اگر آج نہیں تو کل وہی واقعات ضرور رونما ہو کر رہیں گے جو صدیوں پہلے گزر چکے ہیں اس تکرار کے اسباب حد درجہ دلچسپ ہیں۔ اپا ہتکرے، مشہور جرمن مصنف کا خیال ہے کہ یہ بھی کرۂ ارض کے مدور ہونیکی ایک دلیل ہے۔ افراد ہوں یا اقوام ان کی زندگی کی ترکیب کچھ ایسی ہے کہ سب ایک مرکز پر قائم رہنے کیلئے ساعی ہیں۔ اور جب دنیا کی گوناگون پیچیدگیاں انکو مرکز پر قائم رہنے نہیں دیتیں، تو پھر وہ گردش میں آجاتے ہیں۔

امرسن (مایۂ ناز امریکن فلسفی و مضمون نویس) کا خیال ہے کہ فضاء عالم میں دنیا کے اہم تاریخی واقعات ہمیشہ اپنے نقش قدم چھوڑ جاتے ہیں۔ اور جب اس فضاء میں ہم سلف کی تاریخیں پڑھتے ہیں، تو ہم موجودہ زندگی کو گذشتہ واقعات سے مطابقت دینے کی کوشش کرتے ہیں، پھر چونکہ گذشتہ اثرات مستحکم ہوتے ہیں۔ اس لئے ہماری آئندہ زندگی انکے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ ہندو قوم کی موجودہ ترقی اسی اصول پر ترتیب حاصل کر رہی ہے۔ اور اسی اصول کی تحت میں صنف نازک کی ترقی بھی ہے۔ شاید یہ امر اب مسلمات کی حد تک ہے کہ بیسویں صدی سے عورت نے کروٹ لی اور اب وہ شاہراہ ترقی پر نہایت سرعت سے گامزن ہے۔ مشرقی نقطۂ خیال سے ممکن ہے کہ یہ ترقی حجاب سے معرا ہونیکی باعث ترقی نہ مانی جائے، لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اس نے مرد کی غلامی کا جوا اپنی گردن سے اتار کر پھینکدیا اور اب وہ زمانہ دور نہیں، جب ہم مرد و عورت کیلئے دو مختلف میدان عمل نہ بنا سکیں گے۔

صفحات تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی ترقی کا یہ دور دورِ ثانی ہے۔ یعنی وہ محض اپنی کھوئی ہوئی وقعت کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ مذکورہ ذیل واقعات سے آپ بخوبی اس نتیجہ پر پہونچ سکیں گے کہ گذشتہ دور غلامی سے قبل ایک زمانہ ضرور ایسا تھا جب عورتوں کی حکومت تھی اور مرد محکوم تھے۔

آدم و حوا کے قصہ کو محض تاریخی یا تمدنی حیثیت سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ آدم کی دلجوئی کیلئے ایک عورت کی تخلیق اس امر کا بین ثبوت ہے کہ مرد فی نفسہ ایک غیر مکمل جنس تھی۔ اور حوا کا آدم پر غالب آنا عورت کی حکومت کی

تاریخ کا پہلا واقعہ ہے۔

سزا کے دو طریقے ہیں اور ہر طریقہ مختلف غرض رکھتا ہے۔ تنبیہ کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ملزم کو سزا دیکر توبہ کے بعد پھر اس کو اوسکی سابق حیثیت پر قائم کردیا جائے، دوسرا طریقہ سزا ملزم کو اپنے سایہ عاطفت سے علحدہ کردینا ہے اور اسکے معنی یہ ہیں کہ تم جس جرم میں سزایاب ہوئے ہو وہ ناقابل معافی ہے اور ہم سے دور ہو کر تم کو آزادی ہے کہ تم اوسی جرم کا ارتکاب کرو۔ اس نظریۂ سزا کو مدنظر رکھتے ہوئے آدم و حوا کا جنت سے علحدہ ہونا یہی معنی رکھ سکتا ہے کہ جو غلطی تم سے سرزد ہوئی ہے یعنی عورت کی اطاعت اوسمیں تم ہمیشہ مبتلا رہوگے"۔

اب انسان دنیا میں زندگی شروع کرتا ہے تو اس دور حیات کا پہلا واقعہ جس سے عورت کے حاکمانہ اثر کا پتہ چلتا ہے، وہ ہابیل و قابیل کی جنگ ہے، افسوس ہے کہ اس واقعہ کے بعد سے موسیٰ کی لعبثت تک مذہبی تاریخ عورت کے واقعات سے بالکل خالی نظر آتی ہے۔ جس کا سبب غالباً صرف یہ تھا کہ یہ دور عورتوں کی حکومت کا تھا جسکی تاریخ مردوں نے اپنے دوران سیادت میں فنا کردی۔

میں عرض کرچکا ہوں کہ یہ میرا دعوےٰ ابھی تک ایک نظریہ کی حیثیت رکھتا ہے جسکے ثبوت میں کوئی قطعی سند نہیں پیش کرسکتا، لیکن ہاں حسب ذیل واقعات آسانی سے نظرانداز نہیں کئے جاسکتے۔

(۱) شاید یہ امر اب کسی توضیح کا محتاج نہیں کہ انسان کی ابتدائی زندگی اُصول ازدواج کی ممنون نہ تھی۔ نہ کہیں محرمات تھے اور نہ کہیں ممنوعات، چوپایوں کی طرح توالد و تناسل کے لئے مرد و عورت تعلقات میں آزاد تھے اس ماحول کو ملحوظ رکھکر اب آپ اوس زمانہ کی عورت کی حیثیت پر غور کرسکتے ہیں۔ آج ایک لڑکا باپ کو صرف اس لئے باپ سمجھکر اُنس رکھتا ہے کہ وہ اُس سے محبت کرتا ہے اور اُس کا کفیل ہوتا ہے، لیکن جہاں یہ رشتہ سرے سے مفقود ہو وہاں اولاد بجز ماں کے اور تمام دیگر تعلقات سے ناواقف ہوگی اب وہی لڑکا جب جوان ہوا تو بسا اوقات خود اوسکی ماں اوسکی بی بی بنگئی[۵] اس طرح بچپنے سے لیکر جوانی اور بڑھاپے تک وہ صرف عورت ہی کے تعلقات سے واقف رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت کا اثر روز بروز اوس پر بڑھتا رہا۔ اور اس طرح مختلف قبائل قائم ہوگئے جسکی سیادت عورتوں کو نصیب ہوئی

(۲) اس مسئلہ میں دوسرا ذریعہ جس سے ہمیں کچھ واقفیت بہم پہنچتی ہے وہ پرانی مذہبی کتابیں ہیں، جن سے ہم عورتوں کی سیادت کافی طور پر اخذ کرسکتے ہیں۔

انسان کی ابتدائی تاریخ ہمیں بتارہی ہے کہ زراعت سے قبل انسان شکار پر زندگی بسر کرسکتا تھا، زراعت

---

[۵] سیمی سامیس کا لڑکا مزدو تھا لیکن جب جوان ہوا تو اوس نے ماں کو اپنی زوجہ بنالیا، ملاحظہ ہو "پرستش موتے" مصنفہ کرنل جے گارنیر آر۔ ای۔

کا دور جب شروع ہوا۔ اوس وقت اوس نے آفتاب کی ماہیت پر غور کیا۔ تاریخ بت پرستی کے ماہرین کا خیال ہے کہ آفتاب کی پرستش دور زراعت سے شروع ہوئی۔ اس سے قبل انسان ماہتاب کی پرستش کرتا تھا۔ اس نظریہ کے ثبوت میں ہمارے سامنے چار دلائل ہیں۔ (۱) مصر بت پرستی کا مخزن و منبع ہے اور اس ملک کی تاریخ بت پرستی سب سے قدیم ہے۔ مصریوں کی قدیم ترین دیوی اٹسیس (ISIS) ہے جس کے معنی ماہتاب کے ہیں۔ (۲) دوسری دلیل یہ ہے کہ زمانہ شکار میں ماہتاب کی روشنی زیادہ معین ہوتی تھی۔ دن کو جانور بھاگ جاتے تھے لیکن رات کو جب وہ اپنے گھونسلوں یا غاروں میں رہتے تو ماہتاب کی روشنی اون کا شکار کرنے میں بہت مدد دیتی (۳) آفتاب کا وہ معین اپنی غیر مبدل طلوع و غروب سے ساری ندرت کھو چکا تھا، لیکن ماہتاب کا انقلاب اب تک لاینحل اور دلچسپ تھا اس لئے وہ پرستش کے لائق تھا۔ (۴) دور زراعت یقیناً دور شکار کے بعد شروع ہوا، اور چونکہ زراعت کو آفتاب سے زیادہ تعلق ہے اور اسی بنا پر اسکی پرستش شروع ہوئی۔ اس لئے اس سے قبل کے دور میں یقیناً ماہتاب کی پرستش ہوتی ہوگی یہ خیال اس لئے اور بھی قوی ہوتا ہے کہ انسان نے جانور اور پتھر کی پرستش سے قبل اجرام فلکی کی پرستش شروع کی تھی، ظاہر ہے کہ اوسکی نظریں سب سے پہلے آفتاب و ماہتاب پر پڑی ہوں گی (حضرت ابراہیم کا واقعہ اس کا ثبوت ہے) چونکہ آفتاب کا دور زراعت سے شروع ہوتا ہے۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ اس سے پہلے ماہتاب کی پرستش ہوتی تھی جب انسان شکار پر زندگی بسر کرتا تھا۔

جب یہ طے ہو چکا تو صرف یہ ثابت کرنا رہ گیا کہ ماہتاب کی پرستش، عورت کی سیادت پر دال ہے اور اگر میں یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ ماہتاب کی پرستش دراصل عورت کی پرستش تھی تو شاید یہ مسئلہ حل ہو جائیگا ہمارے پاس اس نظریہ کے ثبوت میں دو دلائل ہیں۔

(الف) عورت کو ماہتاب سے بیحد مناسبت ہے۔ جب وہ اپنے بچے کو اپنی گود میں لیکر کسی درخت کے نیچے بیٹھتی اور چاند پر نظر ڈالتی تو وہ یہ سمجھتی اور سمجھتی کہ ماہتاب عالم نسواں کا محافظ ہے وہ آفتاب کو بوجہ خشونت مرد سمجھتی۔ اور ماہتاب کو بوجہ لطافت عورت بناتی[1]۔ ماہتاب کو عورت تصور کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ بھی عورت کی طرح مخصوص و معین اوقات میں "مبتلائے آلام" رہتا[2]۔

(ب) لفظ اٹسیس (ISIS) "ماہتاب" کے اصلی معنی عورت کے ہیں۔ اور یہ مصری دیوی ہرکش ناکس کی منکوحہ تھی، اس کے اوصاف کا علم آپ کو گفتگو سے ہوگا جو اٹسیس نے الوٹیس سے کی تھی کہ:-

---

[1] اس وقت تک اکثر اقوام کے مذہبی قصص میں آفتاب کو مرد اور ماہتاب کو عورت سمجھا گیا ہے۔
[2] وحشی اقوام میں اب تک عورت کو زمانہ مخصوص میں مجبور محض سمجھتے ہیں۔

میں فطرت ہوں، میں ہر شے کی خالق ہوں۔ عناصر میرے غلام ہیں۔ میں ابتدا و زمانہ ہوں، دیوتا اور دیویوں کی خدا ہوں، میری ذات مختلف صورتوں میں مسجود خلائق ہے۔"

اسی کے ساتھ جب آپ دیکھیں گے کہ ماہتاب کی پرستش عورتوں کے ساتھ ساتھ مرد بھی کرتے تھے تو شاید یہ امر واضح ہو جائے گا کہ مرد کا یہ فعل غیر ارادی تھا اور وہ مجبور تھا کہ اوسی خدا کی وہ بھی پرستش کرے۔ جس کی پرستش عورت نے اپنی مخصوص مناسبت سے اختیار کر لی تھی۔ اس جبریہ عبادت کے واقعہ کو اس امر سے اور بھی تقویت پہنچتی ہے کہ زراعت کے شروع ہوتے ہی جب مرد کو سیادت نصیب ہوئی تو اوس نے آفتاب کی پرستش شروع کر دی اور اپنی محکوم عورت کو مجبور کیا کہ وہ بھی اوسی کی پرستش کرے۔

(۳) تیسرا واقعہ جس سے عورت کی سیادت کا پتہ چلتا ہے وہ سانپ اور طاؤس کی پرستش ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آدم کو جنت کے چھٹنے کا بہت غم تھا اور وہ مدتیں دعائیں کرتے رہے، لیکن حوّا نے باوجودیکہ اس "بے آبروئی" سے ملول تھیں کوئی دعا نہیں کی۔ یہ اخراج بھی عورت کی کامیابی پر دال ہے، جسکا ثبوت اوس نے اس طور پر دیا کہ سانپ اور طاؤس کی پرستش شروع کر دی اور اپنے دور حکومت میں اوس نے مجبور کیا کہ مرد بھی اسکی پرستش کرے ورنہ مرد خوب سمجھتا تھا کہ یہ قابل پرستش نہیں بلکہ قابل نفرت ہے۔

یہ واقعہ قابل لحاظ ہے کہ سانپ اور طاؤس کی پرستش کے حالات تاریخ بت پرستی کے ابتدائی اوراق میں پائے جاتے ہیں جس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اوسوقت عورت کا اقتدار تھا اور نہ صرف وہ خود اپنے "محسن" کی پرستش کرتی تھی بلکہ محکوم مرد کو بھی اونکی پرستش پر مجبور کرتی تھی۔

(۴) تاریخ بت پرستی کے ماہرین کا یہ بھی خیال ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں انسان ہر مضر یا نافع اثرات فطرت کی پرستش کرتا تھا اور چونکہ اوس کی مجہول ذہنیت کسی صفت کو متصف کے وجود سے علیحدہ خیال نہیں کر سکتی تھی، اس لئے وہ ہر صفت کے اثرات کی مناسبت سے کسی مخلوق کو تلاش کرتا تھا اور اوسکو انھیں صفات سے متصف کر کے اپنا دیوتا قرار دیتا تھا۔

اس نکتہ کو ملحوظ رکھکر اب آپ دیوتاؤں کی فہرست کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تمام وہ محاسن و معائب جو حاکمانہ قوت و اثر سے متعلق ہو سکتے ہیں، اون سے یہ دیویاں متصف تھیں۔ کیا اس سے اگر آپ اس نتیجہ پر پہنچیں تو غلطی ہوگی کہ اوس دور بت پرستی میں جب ان دیویوں کا وجود عمل میں آیا، تو عورتوں کی حکومت تھی اور وہی برسر اقتدار تھیں۔ اگر یہ دیویاں صرف نسائی صفات (مثلاً حسن و محبت سے متصف ہوتیں تو ممکن تھا کہ اس کی یہ توجیہ کی جاتی کہ مرد کی حسن پرست طبیعت نے یہ ایک خیالی شئے قائم کر لی تھی، لیکن یہاں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ علم و دولت، قوت انتقام سب صفات عورتوں میں موجود تھے۔ اس لئے ہم صحیح طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ایک زمانہ وہ ضرور تھا جب عورتیں

مخصوص طور پر صاحب دولت، صاحب علم اور صاحب اقتدار ہوتی تھیں اور یہی وہ دور تھا جب کہ اونکی حکومت تھی اور مرد محکوم تھے۔

"دیہرما! میں تیری عزت کرتا ہوں، تو عقل کی مخزن ہے، تو ہر مخلوق کو اطمینان بخشتی ہے اور اُنھیں عقل سلیم عطا کرتی ہے، عقلاء کا عقیدہ ہے کہ تو ہر چیز کی خالق ہے اور ہر پاکباز کی تو ماں ہے۔ تو رحیم ہے تو طاقتور اور عاقل ہے"

یہ وہ دعا ہے جو بت کا ہر شخص صبح کو اوٹھکر مانگتا ہے، کیا اس سے آپ اوس اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکتے جو کسی زمانہ میں عورتوں کو حاصل تھی۔ میں نے ذیل کی فہرست میں صرف ہندوستان کی دیویوں کو لیا ہے اور قوموں کی مذہبی کتابوں کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ وہاں بھی یہی حالت ہے۔

نام دیوی	صفت متعلقہ	نام دیوی	صفت متعلقہ
۱۔ ادیتی	تمام دیوتا اور دیویوں کی ماں	۲۔ پرتھوی	ملکۂ ارض
۳۔ اپانا	ملکۂ طاقت	۴۔ اندرانی	بارش کی دیوی
۵۔ لکشمی	دولت کی دیوی	۶۔ سیتا	عصمت کی دیوی
۷۔ پاربتی	طاقت کی دیوی	۸۔ اوما	عقل کی دیوی
۹۔ درگا	طاقت و بہادری کی دیوی	۱۰۔ کالی	انتقام کی دیوی

ابتک میں نے جو دلائل عورت کی سیادت کے ثبوت میں پیش کئے ہیں وہ یقیناً تاریخی حیثیت نہیں رکھتے تھے لیکن عقلی حیثیت سے ان کی اہمیت ظاہر ہے۔ اس کے بعد اب میں اور دلائل کو سامنے لاتا ہوں۔

(۱) یہ ظاہر کیا جا چکا ہے کہ ابتدائی زندگی میں ایسے اسباب یقیناً موجود تھے جس نے عورت کو مرد کی ساری عملی زندگی کا مرکز بنا دیا تھا۔ ابتداء سے انتہا تک اوسکا "سرمایۂ انبساط" جو کچھ بھی تھا وہ عورت ہی سے متعلق تھا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مرد عورتوں کے گرد جمع ہونے لگے۔ آج مرد صرف اس لئے فوقیت کا دعوے رکھتا ہے کہ وہ عورت کی روٹی کا سہارا ہے، مرد کماتا ہے اور عورت مجبول ہے، لیکن دور زراعت سے قبل یہ صورت بالکل نہ تھی۔ شکار میں مرد و عورت دونوں برابر کے شریک تھے بلکہ لبا اوقات عورت اپنی جنسی خصوصیت سے ایسے جانوروں کے شکار میں زیادہ مہارت دکھاتی تھی۔ جو جنساً مردت، مشابہ ہونے کی باعث عورت سے جلد مانوس ہو جاتے تھے۔

(۲) اب تک دنیا میں ایسے مقامات ہیں جہاں موجودہ تہذیب و تمدن کا مطلق گزر نہیں ہوا۔ اور وہاں عورتیں برسر اقتدار ہیں، بڈنگ ہائی لینڈس (ملک نیوگینی) میں عورتوں کی حکومت ہے، وہی قانون بناتی ہیں، وہی

مکان تعمیر کرتی ہیں۔ وہاں شوہر کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ اور ایک مرد اپنی زندگی میں کئی بار مختلف عورتوں کے قبضہ میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ جن کو اوس کی ایک "میک" (تقریباً بائیس پاؤنڈ) قیمت ادا کرتی ہوتی ہے۔

نینگ کابو میں بھی یہی حال ہے اور وہاں مرد وراثت سے محروم ہیں، محض لڑکیاں مورث کے ترکہ کی مالک ہوتی ہیں۔

(۳) جس طرح مردوں نے اپنی سیادت و حکومت کے زمانہ میں ایک سے زیادہ عورتوں کو اپنی زوجیت میں لانا شروع کیا۔ اوسی طرح عورتوں نے بھی اپنی سیادت کے زمانہ میں ایک سے زائد شوہروں کو منتخب کرنا شروع کردیا۔ یقیناً یہ دور اس زمانہ کے بعد آتا ہے جب ہر مرد ہر عورت کے ساتھ تعلقات میں آزاد تھا۔ آج تک نیپال کے قریب میں ایسے مقامات ہیں۔ جہاں ایک عورت دس پانچ شوہر رکھتی ہے۔ وہ لوگ جو عورت و مرد کی شہوانی ذہنیت سے واقف ہیں وہ اس سے کبھی بھی یہ نتیجہ نہیں اخذ کرسکتے کہ یہ طرز ازدواج مرد کی سیادت پر دال ہے۔ اور چونکہ یہ طرز اب مہذب ممالک میں بالکل مفقود ہے۔ اس لئے ہم اسے انسانی زندگی کی ابتدائی تاریخ کہیں گے۔ جو آج تک کہیں نہ کہیں محفوظ و باقی رہگیا ہے۔

(۴) ہر چند کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ہے جس سے ہم اس دور سیادت کو متعین کرسکیں۔ لیکن ہاں چند واقعات ایسے ہیں۔ جن سے ہم یہ طور نتیجہ یہ اخذ کرسکتے ہیں کہ یہ دور آج سے تقریباً پچیس ہزار برس پہلے ضرور موجود تھا۔

آج عورتیں ہر شعبۂ حیات میں اس سُرعت سے ترقی کررہی ہیں، کہ عقلائے مغرب کو یہ خوف ہے کہ چند دنوں میں یہ مردوں کو پس پشت ڈال کر تمامی دفاتر و محکمہ جات میں خود کام کرینگی، باایں ہمہ موجودہ تہذیب و تمدن نے عورتوں کو نازک بنادیا ہے، مغرب میں فربہ عورت بدصورت سمجھی جاتی ہے، مصنوعی زیبائش کی افراط سے جسے قبائے گل میں گل بوٹا پیدا کرنے کی کوشش سمجھئے۔

اب ان حالات کو تھوڑی دیر کے لئے یہیں چھوڑیئے اور ولنڈارف (جنوبی اسٹریا) کے کھنڈروں کو ملاحظہ فرمائیے۔ جہاں سے حال میں مختلف اشیاء برآمد ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر بیر (BAYER) ڈائرکٹر دنیا میوزیم کی قطعی رائے ہے کہ یہ چیزیں آج سے پچیس ہزار برس قبل کی ہیں۔ جو وینس کا بت ۱۹۰۸ء میں اوسی جگہ سے برآمد ہوا تھا وہ بہت بھدا تھا۔ لیکن ۱۹۲۶ء میں جو بت برآمد ہوا وہ نہایت نازک اندام ہے اور اوس میں ہر وہ حسن و خوبی موجود ہے جو موجودہ مذاق کے مطابق ہے۔ اوسی بت کے ساتھ ساتھ کاسمٹک (COSMETIC) کی شیشیاں بھی برآمد ہوئی ہیں۔ آج سے سو برس قبل یورپ میں کوئی شخص کاسمٹک یا اوس کے استعمال سے واقف نہ تھا لیکن ہزارہا سال قبل کی عورت اس کا استعمال جانتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ لب کو سرخ کرنے کا ایک مسالہ بھی برآمد ہوا، ایک ڈبہ میں سفوف بھی ملا۔ جو غازہ سے بالکل مشابہ ہے۔ ایسی پنسلیں برآمد ہوئیں جس سے ابرو سیاہ کی جاتی تھیں۔ اس کھنڈر

کے قریب ہی نازک زیور بنانے کے اوزار مثلاً ہنسائیاں اور ہتوڑیاں برآمد ہوئیں

ہمارے پاس تاریخی عینی شہادتیں عورتوں کے گذشتہ تمدن کی موجود نہیں ہیں، لیکن انھیں واقعات سے ہم بآسانی اخذ کرسکتے ہیں کہ آج جو عورتوں کی حالت ہے، اس سے بہتر حالت اونکی اوس زمانہ میں رہی ہوگی۔ جو مردوں کی حکومت وسیادت سے قبل گزرچکا ہے۔ یہ امر بھی کسی طرح کم قابل لحاظ نہیں کہ مردوں نے اپنے زمانۂ حکومت میں گو انتقاماً صدہا مظالم عورتوں پر کئے۔ لیکن فی نفسہ اونکی روحیں عورتوں کی ہمیشہ غلام رہیں۔ دنیا میں جب غلامی کا رواج تھا (یا اب بھی جہاں باقی ہے) تو غلام دن بھر مزدوری کرکے اجرت آقا ہی کو دیتا تھا۔ وہی اوس رقم کا مالک ہوتا اور جس طرح چاہتا خرچ کرتا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ موجودہ دور میں مزدوروں کی حالت اس سے بہتر ہے وہ دن بھر محنت ومشقت کرتا ہے اور شام کو وہ جو کچھ کماکر لاتا ہے۔ اوسکو اپنی بیوی کو دیدیتا ہے جو اوس رقم سے اوسکی ہر طرح کفالت کرتی ہے، کیا مردوں کی یہ حالت اوس دور غلامی کی یاد کو تازہ نہیں کرتی اور کیا مرد کی یہ عادت اس کی گذشتہ غلامانہ ذہنیت کی یادگار نہیں ہے۔

مرد کی سفاکیاں اور انتقام پسندیاں

جب تک معاش کا ذریعہ صرف شکار تھا اوسوقت تک عورتونکی سیادت قائم رہی، لیکن زراعت کے بعد زمانہ بدلا، ابتداءً تو یہ تفریق، تقسیم عمل کے رد سے تھی کہ عورتیں بچوں کی پرورش کریں اور مرد زراعت کی دیکھ بھال کریں، لیکن بعد چندے یہی تقسیم عمل عورتوں کے زوال کا باعث ہوئی۔ مرد اب رزاق مجازی تھا، عورت اس معاملہ میں اوسکی دست نگر تھی۔ زراعت کی ضروریات کے لحاظ سے مویشی خریدے جانے لگے اور انکی خرید وفروخت مرد ہی کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ زمانہ آیا جب ایک شخص کی دولت مویشیوں کی تعداد پر منحصر ہوتی تھی۔ مرد مویشیوں کا مالک تھا، اسلئے دولت بھی اوسی کی تھی۔

انسان کی فطرت سہولت پسند وآرام طلب ہے، جبتک شکار شغل معاش رہا۔ عورت مرد دونوں کسب معاش میں برابر کا حصہ لیتے رہے۔ لیکن دور زراعت کے آتے ہی مرد کی محنت ومشقت میں اضافہ ہوا تو عورت نے آرام طلبی اختیار کی اور رفتہ رفتہ مرد قوی تر ہوتا گیا۔ جب مردوں نے ایک طرف اپنی گرفت کو مضبوط دیکھ لیا اور دوسری طرف عورتوں کی کمزوری کا بھی یقین آگیا، اوس وقت اوس نے حاکمانہ طرز اختیار کیا۔

مردوں کی سیادت ومظالم کی داستان اس امر کی بین دلیل ہے کہ اس سے قبل عورتوں کی سیادت کا زمانہ تھا اور اوس دور سیادت میں مرد خوش نہ تھے۔

مرد نے سب سے پہلی بنا مخاصمت عورت سے یہ قرار دی کہ وہی اوسکی محرومی جنت کا باعث ہوئی۔ اور چونکہ اس خیال کو مذہبی صورت دیدی گئی تھی، اس لئے جذبات انتقام کو مشتعل کرنے کی اس میں کافی اہلیت تھی۔ اب

تین باتیں اکٹھا ہو گئیں، ایک طرف حکومت، دوسری طرف شکوہ محرومی فردوس اور تیری طرف گذشتہ محکومیت کی یاد، اس طرح مردوں نے دل کھول کر عورتوں پر مظالم کئے، تاریخ شاہد ہے کہ حضرت لوط[۵۱] کے زمانہ میں مردوں نے عورتوں کو جنسی تعلقات سے بھی محروم کرنے کی کوشش کی۔ میرا خیال ہے کہ اگر ایک طرف وہ جذبات فطرت سے مجبور نہ ہوتا اور دوسری طرف قطع نسل کا خوف نہ ہوتا تو شاید وہ عورتوں کو دنیا سے فنا کر دیتا۔

اب آئیے ذرا تفصیل کے ساتھ ان مظالم کی داستان سنئے۔

(۱) ایک چالاک حکمراں کی طرح مرد نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ عورت کو مقید کر دیا، تاکہ مظلوم کی فریاد دنیا میں کسی کو اپنا ہمدرد نہ بنا سکے اور بہانہ یہ تھا کہ عورت حسن و عفت کی دیوی ہے۔ لیکن دراصل یہ طریقہ صرف اس لئے اختیار کیا گیا تھا کہ ایک طرف وہ خود مجبور محض ہو جائیں۔ اور دوسری طرف مظلوموں میں ایسا اتحاد نہ پیدا ہو جائے جس سے ظلم کی پردہ دری ہو۔

(۲) اس طرح مجبور محض بنانے کے بعد پھر مرد کو کثرت ازدواج کی سوجھی۔ عورتیں اپنے زمانۂ عروج میں یہ لطف اوٹھا چکی تھیں تو کوئی وجہ نہ تھی کہ مرد اپنے دور حکومت میں اوس سے لطف اندوز نہ ہوتے۔ گر عورتوں نے اپنے زمانۂ عروج میں مرد پر وہ پابندیاں کبھی بھی عائد نہیں کیں جو مردوں نے عورتوں پر عائد کیں۔ سبب یہ بتایا گیا کہ اس سے خانہ جنگیاں ہوں گی اور نسل خراب ہو گی اور اسی کے ساتھ توریث میں نقائص پیدا ہو جائیں گے۔ حالانکہ اس وقت بھی دنیا میں ایسے ممالک ہیں۔ جہاں عورتیں ایک سے زیادہ شوہر رکھتی ہیں۔ لیکن وہاں نہ خانہ جنگی ہے اور نہ اصول توریث میں فرق و اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے یہ اصول توریث بھی تو مردوں ہی کے بنائے ہوئے ہیں۔ اول الذکر صورت بھی اگر آپ چاہتے تو قابل عمل ہو سکتی تھی۔ لیکن یہاں اصل مقصد تو انتقام تھا اور دوسرا اپنے جذبۂ نفسانی کی آسودگی کے لئے نامحدود دائرہ عمل پیدا کرنا۔ مردوں کو تو یہ اختیار تھا کہ اگر عورت مریض ہو تو وہ دوسری عورت سے عقد کر لیں لیکن غریب عورت صرف اوسی وقت اپنے مریض و ناکارہ شوہر سے چھٹکارا حاصل کر سکیگی جب وہ خود مر جائے[۵۲]۔ شوہر کی وفات بھی اوسکی زندگی کو بہتر نہیں بنا سکتی۔ اس لئے کہ بیوہ کی شادی ناجائز بتائی گئی۔

---

[۵۱] مذہب نے اس بدکاری کو معصیت قرار دیا۔ نفسیات ـــــ اسے شہوانی بدمذاقی سے تعبیر کرتی ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ اس فعل کے پس پردہ مردوں کے دلوں میں صرف جذبۂ انتقام کار فرما تھا۔ آج یورپ میں یہی وہ جذبہ منافرت ہے جس نے مصنوعی مرد و عورت کا رواج قائم کر دیا ہے۔

[۵۲] سب سے پہلے اسلام نے خلع و عقد بیوگان کی اجازت دی لیکن ہندوستانی اثرات نے اونکی ذہنیت بھی بدل دی اور اب وہ بھی اسے معیوب سمجھتے ہیں۔

عرب و ہند میں لڑکیاں مار ڈالی جاتی تھیں اور ہندوستان میں بیوہ کا فرض تھا کہ وہ مرد کی نعش کے ساتھ جلکر مرجائے بیوہ بن کر زندہ رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ جس کے صریحی یہ معنی ہیں کہ عورت کی زندگی محض مرد کی نفسانی خواہشات کی آسودگی کے لئے ہے۔ گویا عورت کا تخیل ہی اس کے علاوہ کچھ نہ تھا کہ وہ ایک مرد کی دلچسپی کے لئے زندہ رہے اور جب مرد کی زندگی ختم ہو تو اوس کے ساتھ وہ بھی فنا ہو جائے۔

(۳) عورت عقد و مناکحت سے گریز نہیں کر سکتی تھی، لیکن ہاں ایسی صورتیں پیدا ہوتی تھیں جب مرد متاہلانہ زندگی سے گھبرا کر عقد سے احتراز کرتے تھے۔ صرف اس خیال سے کہ ایسے افراد بڑھ کر ایک ایسی جماعت کی صورت نہ اختیار کرلیں جس کا احتراز ممکن ہے کبھی ہمدردی کی صورت اختیار کرلے، حکومتیں (جس میں صرف مرد شامل رہتے تھے) اس امر پر مردوں کو مجبور کرتی تھیں کہ وہ عقد کریں۔ اہل روما نے غیر شادی شدہ مرد کو بیشتر حقوق سے محروم کر رکھا تھا۔ اسپارٹا میں اوسکی زندگی محال تھی۔ اہل اتھنس اوسکو پارلیمنٹ میں داخل نہیں کرتے تھے اور فوج کی سرکردگی صرف ایسے ہی سپاہیوں کو دیجاتی جن کی نہ صرف عورت موجود ہو بلکہ وہ صاحب اولاد بھی ہوں آج بھی باینہمہ تہذیب و مساوات آئرلینڈ و فرانس میں اون لوگوں پر محاصل عائد کئے جاتے ہیں، جو عقد سے بغیر وجہ معقول کے محترز ہیں۔

عورتوں کے لئے اس قسم کے قانون کی غیر موجودگی صاف بتا رہی ہے کہ وہاں انکار و احتراز کا کوئی سوال ہی نہیں وہ تو مردوں کے ہاتھ میں ایک کھلونے کی حیثیت رکھتی ہے اور اطاعت بغیر شروط اوسکا فرض ہے۔

(۴) آپ مظالم کی تدریجی ترقی پر غور کرتے جائیں اور دیکھیں کہ بانیان تہذیب و مذہب نے بھی بے زبان عورتوں پر کیا کیا مظالم کئے ہیں۔ عورت کے لئے یہی کافی نہ تھا کہ وہ عورت ہو بلکہ وہ کمسن بھی ہو۔ مرد و عورت کی عمر میں خواہ کتنا ہی تفاوت کیوں نہ ہو لیکن عورت کو کوئی حق نہیں کہ وہ عقد سے منکر ہو۔ ستر برس کے بڈھے ۱۲ برس کی کمسن لڑکیوں سے عقد کرتے ہیں۔ اور پھر اپنی قوت پر فخر کرتے ہیں۔ اونھیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ اونکی موت ایک نوجوان عورت کی زندگی کو تباہ کردے گی۔ بیوہ بھی ایسی جس کو دوسری شادی کا حق نہیں۔ ساردا بل کے سلسلہ میں جو کمیٹی مقرر ہوئی تھی اوس نے یہ رپورٹ دی تھی کہ نہ صرف مرد و عورت میں ضعیف و نوجوان کا فرق ہوتا ہے، بلکہ اکثر ادھیڑ اور ضعیف مردوں کی شادی ایسی لڑکیوں سے کردی جاتی ہے جو ہنوز جوان بھی نہیں۔ ظلم کی یہیں پر انتہا نہیں، جنوبی ہند میں (بشرط اختلاف جنس) ایسے دو بچوں میں بھی عقد ہو جاتا ہے جو ہنوز بطن مادری سے باہر بھی نہیں آئے۔

(۵) آپ آگے بڑھتے جائیں اور دیکھتے جائیں کہ مرد نے عورت کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ عورت کا صرف یہی فرض نہیں کہ وہ مرد کے جذبات جنسی کو آسودہ کرے، خواہ اوسکی صحت خراب ہو جائے یا وہ مر جائے، بلکہ اوس کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ شوہر کو اولاد بھی دے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ خواہ اس کی عمر اس قابل ہو یا نہ ہو مس میو (MISS MAYO)

نے جس مقصد سے اپنی کتاب "مادر ہند" تحریر کی ہے وہ نہایت قابل نفرت ہے لیکن افسوس کہ معترضین نے اون واقعات کی صحت سے آج تک انکار کرنے کی جرات نہیں کی۔ آج جو ہندوستان میں حالت ہے کم و بیش یہی حال چند صدی قبل مغرب میں تھا۔ لیکن اس سے نہ اعتراضات کمزور پڑتے ہیں اور نہ ہماری برائت ہوتی ہے۔ آج ہندوستان میں ہزارہا عورتیں دعا و تعویذ و گنڈے میں صرف اولاد کی خواہش کی باعث مبتلا ہیں اور یہ خواہش اون کے دل میں صرف اس لئے پیدا ہی کہ مرد اولاد کا بیحد خواہشمند ہے۔ ابھی چند دن ہوئے کہ ایک عورت نے صرف اولاد کی خاطر اپنے ہمسایہ کے ننھے بچہ کو ذبح کرکے اُس کے خون سے غسل کیا۔ مرد زیادہ سے زیادہ شادی کے بعد تین سال تک اولاد کا انتظار کرتا ہے اوسکے بعد وہ دوسرے عقد کی فکر کرتا ہے۔

(۶) پھر لطف تو یہ ہے کہ اولاد کی بھی کوئی تعداد معین نہیں۔ اگر عورت بانجھ ہے تو اوس کا ذکر ہی نہیں اسلئے کہ وہ بحید منحوس سمجھی جاتی ہے اور کوئی عورت اوس کا منھ دیکھنا گوارا نہیں کرتی۔ اگر ایک اولاد ہوئی تب بھی اوس پر اکتفا نہیں ہندوستانی قصبات میں ایک ضرب المثل ہے کہ "بانجھ سے بری اکوکھ" (ایک اولاد والی بانجھ سے بھی بری) اس مثل سے آپ ہماری ذہنیت کا اندازہ کرلیں۔ غرض عورت کیا ہے بچہ جننے کی مشین ہے، گھر اولاد سے بھرا رہے خواہ گھر میں فاقے ہوتے ہوں یا عورت کی جان جاتی رہے۔

(۷) ان دو مخصوص معاملات میں مرد کی ذہنیت کا اندازہ آپ صرف اس سے کرلیں کہ اوس نے اپنی بد مذاقی کو مستحکم کرنے کے لئے صدہا طریقے ایجاد کئے۔ عورت کے جنس کی علانیہ تضحیک و توہین ہوا کی۔ اس کی عریاں و غیر مہذب فرضی تصویریں شائع کی گئیں۔ اور اس طرح نہ صرف دنیا کی نظروں میں اونکی عصمت و عفت کی علانیہ توہین کی گئی۔ بلکہ بد مذاق مردوں کا ایک گروہ تیار ہو گیا۔ جو ان باتوں کو بہطور معیار سامنے رکھ کر عورتوں کی تذلیل و تحقیر کی نت نئی ترکیبیں سوچتا رہتا ہے۔

(۸) ممکن ہے کہ خود غرضانہ بد مذاقی مذکورہ بالا مظالم کے لئے سفارشی ہو۔ لیکن مردوں کے پاس اس کا کیا جواب ہے کہ انھوں نے زن بازاری کا ایک مستقل ادارہ قائم کر رکھا ہے۔ کیا یہ عورتوں کے دامن عصمت پر ایک بدنما دھبہ نہیں ہے، جنوبی ہند میں دیو داسیاں مندروں پر چڑھائی جاتی ہیں۔ کیا یہ فعل مذہب کے پردہ میں عورتوں پر ظلم کی حیثیت نہیں رکھتا۔

مذکورہ بالا مظالم صرف مرد کی ایک بد مذاقی کا نتیجہ ہیں۔ اب آپ ذرا وسیع دائرہ میں آئیں اور عورت کی معاشرتی و قانونی زندگی کو ملاحظہ کریں۔ جس کے لئے میں پھر آپ کو اوسی دور زراعت کی جانب متوجہ کروں گا جس سے مردوں کی سیادت کی ابتداء ہوئی ہے۔

(۹) عورت کو مقید کرنے کے بعد مرد نے اوسکے مذہب کو فنا کرنیکی کوشش کی۔ عورت ماہتاب کی پرستش کرتی تھی اس لئے کہ اوسکی لطافت اوس سے مشابہ تھی۔ مرد نے سب سے پہلی ترمیم یہ کی کہ بجائے ماہتاب کے، آفتاب کی پرستش

شروع کردی۔ دیویوں کے مقابلہ میں دیوتا اختراع ہوئے اور اونکی پرستش ہونے لگی۔

اس دور کی تاریخ بت پرستی نہایت دلچسپ ہے اور اس کے مطالعہ سے نہایت مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

(الف) زراعت کے لئے جو چیزیں مفید ثابت ہوئیں۔ اونکی پرستش بطور دیوتا ہونے لگی۔ مثلاً آفتاب و بارش، مویشی، لیکن بعض ایسی چیزیں بھی تھیں جو زراعت کے لئے مضر تھیں۔ حصول نفع کے ساتھ ساتھ رفع ضرر کا بھی خیال پیدا ہوا اسلئے برق و بجلی کی بھی پرستش ہونے لگی۔

(ب) دیوتاؤں کی محبت و ہوس کے قصص اختراع ہوئے، جس میں عورت کو نہ صرف ماتحت حیثیت دی گئی بلکہ اس کے اخلاق کو بد تا ثابت کرنیکی کوشش کی گئی۔

"جب سرما (دیوتاؤں کی محبوبہ) گم شدہ مویشیوں کی سراغرسانی کے لئے بھیجی گئی تو اوس نے پامنس سے رشوت لے لی اور دودھ کھالیا پر اندرانے جب پوچھا تو وہ انکار کرگئی، اس پر اندرانے اوسکو ٹھوکر ماری جس سے دودھ نکل پڑا۔ اندرانے کہا کہ بیوفا عورت!" (انوکرامانیکا)

رشی و دیوتاؤں کے لئے صدہا عورتیں وقف تھیں اور ان پر کوئی اخلاقی پابندیاں نہ تھیں۔ اندرانے معمولی سے قصور پر اپنی محبوبہ دیہانا کو قتل کرڈالا۔

(ج) عورتوں نے اپنے زمانۂ عروج میں سانپ کو اپنی دیوی بنا رکھا تھا اس لئے کہ وہی عورت کی فتح کا باعث ہوا مردوں نے اپنے زمانۂ عروج میں سانپ کو اندرا کا دشمن قرار دیا۔ یونانی اور مصری مذہبی قصص میں بھی سانپ کی یہی حالت دکھائی گئی ہے۔

(د) عورتوں نے اپنے زمانہ میں دیویوں کو تمامی محاسن کا مجموعہ بنا رکھا تھا۔ مردوں نے نہ صرف اپنی حکومت میں مقابل کے دیوتا اختراع کئے بلکہ ایسی فرضی مونث شخصیتیں ایجاد کیں جو معائب کا مجموعہ تھیں۔ رات کو ایک عورت کی حیثیت دی گئی جو اپنی تاریکی میں ہزارہا معاصی کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، لیکن اوسکی ساری شرارتیں اندرا (دیوتا) کے آتے ہی ختم ہوجاتی ہیں۔ فارسی اور عربی قدیم شاعری میں بھی اس قسم کی تخیل موجود ہے۔

(ہ) تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ بت پرستی نے بھی رنگ بدلا۔ اب دیوتاؤں کے قصص محض لغو و لاطائل واقعات کا مجموعہ نہیں ہوتے تھے بلکہ اون سے عابدانہ خلوص و ایثار مترشح ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس انقلاب کے دو اسباب تھے (۱) پیغمبروں کی تعلیم جس نے بت پرستوں کی ذہنیت میں ایک انقلاب پیدا کردیا تھا۔ اس دور کے بت بالذات کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے بلکہ معتقدین اونکو پرتو الٰہی بتاتے تھے۔ پیغمبروں کی تعلیم وحدانیت نے دیوتاؤں میں بھی امتیاز قائم کرکے مہادیو ایسی فرضی ہستیوں کو سب سے بڑا دیوتا قرار دیکر خدا کے مثل بنا دیا تھا واضح ہو کہ اس وقت بھی مہادیو کی شخصیت مذکر ہی رکھی گئی۔ (۲) دوسرا سبب وہی "قصہ آدم" کی افسوسناک یاد۔ مرد کے دل میں ابتک جاگزیں تھی اسکے

ذہن سے یہ بات محو نہیں ہوئی تھی کہ اوسکی محرومی جنت کا سبب عورت ہے۔ اوسکی خواہش تھی کہ وہ پھر اوسی دنیا میں پہونچ جائے جہاں امتیاز صید و صید افگن کچھ نہ تھا۔

ملاحظہ ہو رگ وید کی یہ دعا:-

"اے سوما! تو مجھے وہاں لے چل جہاں غیر فانی روشنی ہے اور جہاں آفتاب کی حکومت ہے، جہاں زندگی آزاد ہے، جہاں ہمیشہ خوشی و مسرت ہے؛ مجھے وہاں لیجاکر تو پھر غیر فانی بنا دے۔"

(۱۰) معبودوں کی تبدیلی کے بعد، دوسری پابندی عورت پر یہ عائد کی گئی کہ وہ عبادت گاہوں میں نجائے، مقصد صرف یہ تھا کہ وہ دیوتاؤں کی عنایت سے محروم رکھی جائے۔ آج مسلمانوں میں بھی اس قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ مخدوم صاحب کا چراغ کوئی عورت نہیں چھو سکتی ہے، اونکے مزار پر عورت کے جانے کی ممانعت ہے۔ رسول عربی کے مزار کی زیارت میں تو کوئی اس قسم کی پابندی نہیں۔ لیکن غلامان رسول کی زیارت پر یہ پابندیاں آپ اپنے وجوہ بیان کرتی ہیں۔

(۱۱) آج ہماری سیاسی غلامی کو صرف ڈیڑھ سو برس ہوئے ہیں۔ لیکن اس قلیل عرصہ میں ہمارے اخلاق و محاسن جسطرح تباہ و برباد ہوئے اوسکی مستقل اک داستان ہے۔ پھر آپ بیس پچیس ہزار برس کی طویل مدت غلامی کا اندازہ کیجئے۔ مجھے تو بقول ڈاکٹر سٹرینڈن تعجب آتا ہے کہ عورتیں کیونکر اپنی ہستی کو فنا و تباہی سے محفوظ رکھ سکیں اور اس طویل مدت میں جو بھی مصائب ان پر نہ آجاتے وہ کم تھے۔ اوس پر طرہ مردوں کی نشر و تبلیغ جس نے عورتوں کے اخلاق و ذہنیت کے متعلق عجیب و غریب غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں۔

عورتوں میں جو نقائص پیدا ہیں انکی اگر آپ تحلیل کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کوئی نقص فطری نہیں بلکہ تمام غلامی کی باعث پیدا ہوتے ہیں۔ اور مردوں میں جو محاسن ہیں اون کا سبب بھی صرف حکومت ہے۔ اگر آج آپ عورتونکو آزاد کر دیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ سارے عیوب جاتے رہیں گے۔

کہا جاتا ہے کہ عورتیں حسب ذیل نقائص سے مملو ہیں۔ اب آپ اون نقائص کی تحلیل کریں اور دیکھیں کہ اونکے اسباب کیا ہیں:-

عورت کی جسمانی کمزوری کا سبب محض اوسکا پردہ ہے۔ مغرب میں جہاں پردہ نہیں وہاں آپ کبھی بھی انھیں اسقدر جو مریض و کمزور نہیں پائیں گے۔ گذشتہ مردم شماری سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان عورتیں بالخصوص زیادہ امراض میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو گئیں۔ اس قید و بند نے انھیں بزدل بھی بنا دیا، اونکی ساری قوت اندفاعی فنا ہو گئی، اگر وہ تنہا چھوڑ دیے جائیں تو کبھی بھی کسی حملہ کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ چہار دیواری کی زندگی نے اونھیں آرام طلب، تلون پسند و سکون و جمود کا مائل بنا دیا۔ چونکہ کمزور کا آلہ ہمیشہ مکر و فریب ہوا کرتا ہے۔ اس لئے نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں میں مکر و فریب آگیا، جسمانی کمزوری

دماغ و دل کمزور ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ذکی الحس و ضدی ہو گئیں۔

یہ تو جسم کی حالت ہوئی، اب آپ اونکی عقل کو دیکھئے۔ عقل، میل جول، سفر و علم سے بڑھتی ہے۔ یہاں آپ نے اونکو بالکل جاہل بنا رکھا ہے۔ مسلمان گھروں میں اب تک کہیں کہیں یہ خیال باقی ہے کہ عورت کو صرف قرآن پڑھ لینا چاہیئے اوسکو اور کتابیں نہ پڑھائی جائیں۔ اور کتابت کی تو اوسے سخت ممانعت ہے۔ جب یہ حال ہے تو پھر اوسکی عقل ظاہر ہے کہ کیا ہو گی۔ ایک جاہل میں جتنے اخلاقی معائب پیدا ہو سکتے ہیں۔ وہ سب اوس میں خود بخود آ جائیں گے۔ ملنے جلنے کی اوسے اجازت نہیں۔ سفر کی اوسے ممانعت، کتابوں کے مطالعہ و تحریر سے قطعی اجتناب کا حکم پھر اگر عورت توہم پرست ضعیف العقل نہ ہو تو حیرت ہے۔

اب چند نقائص ایسے ہیں جنکو صرف پروپگنڈا کہا جا سکتا ہے۔ انگریزی میں ایک محاورہ ہے، (Frailty thy name is woman بیوفائی تیرا نام عورت ہے۔ یہ ضرب المثل عورتوں کے خلاف تقریباً ہر ملک و قوم میں زبان زد ہے۔ حالانکہ عورت کی وفا شعاری کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت مل سکتا ہے کہ اوس نے ایک تابعدار غلام کی طرح پچیس ہزار برس تک انواع و اقسام کے مظالم سہے لیکن آج تک اوس نے کوئی بغاوت مردوں کے خلاف نہیں کی۔ اوس کو آپ نے چڑیوں کی طرح قید میں رکھا، وہ خوش رہی، اوس کو آپ نے جاہل رکھا اوس نے کبھی چون و چرا نہیں کی۔ اوسکو اپنے جذبات کی آسودگی کا بدترین ذریعہ بنایا لیکن وہ خاموش رہی۔ اوس کو آپ نے قتل کیا۔ لیکن وہ کچھ نہ بولی۔ آپ نے حکم دیا کہ وہ آگ میں جلکر خاک سیاہ ہو جائے۔ لیکن ان انتہائے وحشیانہ ظلم کے خلاف اوس نے کبھی زبان تک نہ ہلائی۔ کیا یہ ستم ظریفی نہیں کہ بایں ہمہ آپ اوسے بیوفا اور سرکش کہتے ہیں۔

انفرادی طریقہ پر اگر عورت کی بیوفائی کی مثالیں ملیں گی بھی تو اوس کے دو جواب ہیں۔ اول یہ کہ ذرا آپ اپنے گریبان میں سر ڈال کر دیکھیں کہ آپ کس درجہ باوفا ہیں۔ آپ عورت کی جان نثاری و محبت کو صرف اس ایک قصور میں بھلا دیتے ہیں کہ اوس نے آپ کو کوئی اولاد نہیں دی۔ قصور بھی وہ جس پر اوسکو کوئی قابو نہیں۔ سزا بھی ایسی جس سے زیادہ تکلیف دہ سزا عورت کے لئے ہو نہیں سکتی۔ آپ فوراً دوسری شادی کرتے ہیں اور اوس غریب کو بھلا دیتے ہیں۔ اول تو آپ اوسے طلاق نہیں دیتے اور اگر آپ دیں بھی تو کس کام کا جب وہ دوسری شادی کے لئے آزاد نہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ عورت کے خلاف سارے پروپگنڈے یا اوسکے واقعی نقائص کی ساری ذمہ داری مردوں کے سر ہے اور اوسکا سبب صرف یہ ہے کہ مرد اپنی بے حیا ذہنیت سے عورت کی ذہنیت کا اندازہ لگاتا ہے اور وہ عورت کو صرف اس لئے پردہ سے باہر نہیں نکالتا یا اوسکو جاہل رکھتا ہے کہ اوسکو عورت کا اعتبار نہیں۔ اس عدم اعتماد کے اسباب بھی نہایت دلچسپ ہیں۔ پہلا سبب تو وہی ہے جو میں عرض کر چکا ہوں یعنی وہ اپنی بے حیا ذہنیت سے عورتوں کی ذہنیت کا اندازہ کرتا ہے۔ مرے اس دعوے کے ثبوت میں آپ اس ضرب المثل کو ملاحظہ فرمائیں جو مردوں میں رائج ہے کہ دوسرے کی عورت ہمیشہ اپنی

عورت سے اچھی معلوم ہوتی ہے۔" یہ وہی ذہنیت ہے جس نے آج تک مردوں کو اجازت نہیں دی کہ وہ عورتوں کو پردہ سے باہر نکالیں۔ وہ خائف ہیں کہ کہیں اونکی نظروں میں بھی دوسروں کے شوہر اپنے شوہر سے بہتر نظر نہ آجائیں۔

دوسرا سبب مظالم کی پردہ دری کا خوف ہے۔ اونھیں خوف ہے کہ باہر نکل کر دنیا کے سامنے میرے جبر و تشدد کا بھانڈا اپھوٹ جائے گا۔ محبت سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ مردوں نے کبھی عورتوں سے محبت نہیں کی، اونکا تعلق تو بالکل تجارتی اصول پر رہا۔ عقد و مناکحت کے بعد ایک ہندوستانی مرد اپنی زوجہ سے حسب ذیل افعال کا متمنی ہوتا ہے۔ (۱) وقت و بیوقت بلا عذر تعلقات جنسی کی اجازت (۲) اولاد پیدا کرنا اور لطف یہ کہ اوسکا زندہ بھی رکھنا۔ ستمبر کے ٹائمس آف انڈیا میں ایک واقعہ شائع ہوا تھا کہ ایک شخص نے صرف اس لئے اپنی زوجہ سے انقطاع تعلق کر لیا کہ اوسکے بچے زندہ نہیں رہتے تھے۔ (۳) مرد کے آرام و آسائش کے سامان کی فراہمی۔ اگر ان تین امور میں کبھی کوتاہی ہوئی تو تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں۔ پھر اگر آپ اس اصول ازدواج کو تجارت نہ کہیں گے تو کیا کہیں گے۔

میں نے صدہا ایسے مرد دیکھے ہیں۔ جنکو خواہش ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے سروں پر پاؤں رکھکر چلیں اور لوگ انھیں شاہان اودھ کے خاندان سے ضرور سمجھیں۔ لیکن اونکے گھروں کا حال دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اونکی اہلیہ کا یہ عالم ہے کہ خادمہ سے بدتر ہے۔ مرد سمجھتا ہے کہ وہ جو کچھ کماتا ہے اپنے لئے کماتا ہے اور عورت کو قوت لایموت سے زائد کا حق نہیں ہے۔

(۴) جسطرح بچوں کو کھلونے دیکر بہلاتے ہیں۔ اوسی طرح مردوں نے عورتوں کو پوشاک و زیور[۵] میں بہلا رکھا ہے۔ عورت مجسمۂ حسن ہے۔ اور اوسے کسی زیور کی ضرورت نہیں۔ اگر فطرت کا مقصود عورت کا زیور سے آراستہ کرنا ہوتا تو قمری کی طرح اوسکے گلہ میں بھی طوق ہوتا۔

مگر یہاں تو مرد کا مقصود ہی کچھ اور تھا۔ بیلوں کی طرح نتھنوں میں سوراخ کر دیا گیا۔ غلاموں کی طرح کانوں میں حلقے اور گلوں میں طوق ڈالدئے گئے۔ پاؤں میں قیدیوں کی طرح بیڑیاں ڈالدی گئیں اور سادہ لوح عورت سے یہ کہا گیا کہ یہ زیور ہیں جو اوسکی زیبائش کو دوبالا کریں گے۔ اگر زیبائش بفرض محال مان بھی لی جائے تو یہ کس کے لئے تھی یہ بھی مرد کے لئے تھی۔ اور اس میں عورت کی کوئی منفعت نہ تھی۔ ستم ظریفی تو یہ کہ یہ زیور بھی غریب عورت کی ملکیت متصور نہیں ہوتے جبتک چاہا رکھا اور جب چاہا بیچ ڈالا یا واپس لے لیا۔

---

۵ زیور کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلا زیور عورت نے کانوں میں پہنا، اور یہی زیور غلاموں کو بھی پہنایا جاتا تھا۔ چنانچہ فارسی زبان میں "حلقہ بگوش شدن" کے معنی ہی غلام ہونے کے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے مرد نے اسی غرض سے عورت کو یہ حلقہ کانوں میں پہنایا تھا۔ جس کی نوعیت امتداد زمانہ سے بدل گئی۔ بالکل یہی حال طوق غلامی کا تھا جسے عورتوں نے اختیار کر لیا۔ "طوق غلامی" اب تک فارسی محاورہ جاری ہے۔

انگریزی میں ایک ضرب المثل ہے، جس سے آپ مردوں کی ذہنیت کا اندازہ کر سکیں گے۔

A man is as old as he feels & a woman as old as she looks

مرد کی عمر اوس کے جذبات پر منحصر ہے اور عورت کی عمر اوسکی صورت پر۔ اس مثل سے آپ کم سے کم یہ ضرور سمجھ لیں گے کہ عورت مردوں کے لئے زندہ رہتی ہے اور اوسکا فرض ہے کہ وہ خوبصورت بنی رہے۔ خواہ اوس کے جذبات اندرونی کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ مرد کو یہ استحقاق ہے کہ وہ اپنے جذبات کو ترتیب و تربیت دے۔ اس لئے کہ اوس کی تندرستی و عمر اوسی پر منحصر ہے لیکن عورت کو یہ حق حاصل نہیں۔

کاجل۔ سرمہ۔ چورن۔ منجن

(اوڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤں کا اطمینان کر کے اپنی رائے انکے مفید ہونے پر اور انکے کمالات ملاحظہ میں ظاہر کی ہے)

صرف یہ چار چیزیں تیار ہیں اور اگر آپ اعتبار کریں تو یہ کہوں کہ ان میں سے ہر ایک چیز پورے بیس سال سے میرے خاندان میں تجربہ کی جا رہی ہیں۔

کاجل جو آنکھوں کے تمام امراض کے لئے بیحد مفید ہے۔ سلائی لگاتے ہی ٹھنڈک سی معلوم ہونے لگتی ہے۔ جنکی آنکھیں آشوب کرتی رہتی ہیں سیاہ میلی ہو جاتی ہیں۔ یا سرخی پیدا ہو جاتی ہے یا نزلہ کا پانی آتا رہتا ہے یا ضعف بصارت پیدا ہو چلا ہے۔ انکے لئے ہر روز رات کو ایک سلائی لگا لینا چند دن میں تمام شکایتیں دور کر دیتا ہے۔ ایک ڈبیہ جو ایک شخص کیلئے سال بھر کو کافی ہے قیمت عمر علاوہ محصول۔

سرمہ یہ بیش بہا سرمہ ۴۰ دن میں تیار ہوتا ہے۔ اسمیں ممیرہ ہے اور کوئی جواہر مثلاً موتی سرمہ ہے جسکو جڑی بوٹیوں کے عرق میں پیسکر تیار کیا جاتا ہے۔ اس کے فوائد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جالا، دھند، موتیابند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے اور بارہا آزمایا ہوا ہے۔ قیمت فی پڑیا (عمر) علاوہ محصول۔

چورن یہ وہ اکسیری چیز ہے جسکا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔ پیٹ کا درد، قبض، نفخ، ریاح کا پیدا ہونا، سوء ہضم، دستوں کا آنا سب یکلخت اسکے استعمال سے دور ہو جاتا ہے کیسا ہی شدید درد پیٹ میں ہو فوراً ایک چٹکی کھانے سے جاتا رہتا ہے قیمت فی ڈبہ ۲ تولہ عہ علاوہ محصول

منجن ۔ اسکی ادنےٰ خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں۔ قیمت فی ڈبہ ۲ تولہ (عمر) علاوہ محصول۔

نوٹ۔ سب چیزیں منگانے والوں کو محصول ڈاک معاف۔

م۔ بیگم۔ نمبر ۴۲۔ نظیر آباد لکھنؤ

جھُوٹ

"تم جھوٹ بول رہی ہو! مجھے معلوم ہے تم جھوٹ بول رہی ہو!"

"تم کیوں غل مچائے جا رہے ہو؟ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر ایک سُن لے؟"

اس نے پھر جھوٹ بولا، میں چیخ نہیں رہا تھا۔ میں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے بہت آہستہ آہستہ باتیں کر رہا تھا، اور لفظ "جھوٹ" بھی میری زبان سے اس آہستگی کے ساتھ نکلا تھا جیسے سانپ کی پھنکار۔

اس نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا: "مجھے تم سے محبت ہے، باور کرو کہ محبت ہے، کیا تمہیں اعتبار نہیں۔" مگر جب میں نے اپنی آغوش کھولی تو وہ غائب ہو چکی تھی۔ وہ سرعت کے ساتھ تاریک برآمدہ کو عبور کرتی ہوئی اس ہال میں پہنچی۔ جہاں اب رقص ختم ہو رہا تھا۔ میں بھی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

میں رقص گاہ میں ایک طرف جا بیٹھا۔ لیکن چونکہ اجنبی تھا اس لئے کوئی میری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ میرے قریب ہی سازندے بیٹھے تھے اور بگل کا منھ میری طرف کئے ہوئے شور محشر مچا رہے تھے اور "ہا، ہو ہو" کی پیہم آوازیں میرے کان میں آرہی تھیں۔

رقص جاری تھا اور کبھی کبھی میرے قریب سے ایک عطر بیز جھونکا گذرتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ یہ میری محبوبہ تھی! مجھے معلوم نہیں کہ اس نے سب کی نظریں بچا کر مجھے کیونکر ایک ہلکا سا ٹھوکا دیا جب میں نے ذرا نظریں اُٹھا کر دیکھا تو سامنے ایک سفید گردن اور سفید سایہ نظر پڑا۔ وہ اس قدر حسین معلوم ہو رہی تھی جیسے کسی فراموش شدہ مردہ کی قبر پر متفکر فرشتہ۔ اسکی آنکھیں بڑی بڑی، خاموش اور پر نور تھیں، انکے گرد گھنی پلکیں تھیں یہ آنکھیں مجھے ہمیشہ سیاہ گہری اور اتھاہ معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے ان کی طرف ایک لمحہ کے لئے دیکھا مگر یہ اس قدر قلیل عرصہ تھا کہ قلب صرف ایک دفعہ دھڑک سکا!

وہ میرے پاس سے چلی گئی اور اپنے ساتھ میری روح، میری جان غرض سب کچھ لے گئی۔ وہ ایک دراز قد خوش رو آدمی کے ساتھ پھر رقص کرنے لگی۔ میں نے اس شخص کو سرتاپا غور سے دیکھا ایک ایک تفصیل پر غور کیا اور گو وہ میری طرف کبھی کبھی بے خیالی سے دیکھ لیتا تھا مگر میرا دل بیٹھا جا رہا تھا میں دیوار کی طرح سخت و منجمد ہو گیا تھا۔

جب شمعیں بجھنے لگیں اور رقص ختم ہو گیا میں نے اس سے کہا: "چلو تمہیں گھر پہنچا آؤں۔"

اسے اس پر شاید کسی قدر تعجب ہوا اور کہنے لگی: "مگر میں تو اُس کے ساتھ جا رہی ہوں"۔ یہ کہکر اُس نے اُس خوبصورت آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ مجھے ایک خالی کمرہ میں لیگئی اور رخصتی بوسہ دیا جس کے جواب میں میں نے کہا "تم مجھے فریب دے رہی ہو! تم جھوٹی ہو!"

میں گاڑی میں سوار ہوا اور گھر روانہ ہو گیا۔ بازار بھی سنسان تھا۔ صبح کی کہر مکانوں کی چھتوں پر چھائی ہوئی تھی۔ میں اور میرا ملازم دونوں خاموش تھے۔ وہ سر جھکائے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ میں بھی سردی سے کوٹ کے کالر میں منھ ڈہانپے ہوئے اپنے خیالات میں غرق تھا۔ لوگ ابھی تک مکانات میں سو رہے تھے اور خواب دیکھ رہے تھے۔ میں بھی خواب دیکھ رہا تھا۔

مجھے رہ رہ کر اس قتالۂ عالم کا خیال آ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی میں اپنے آپ کو مردہ سمجھنے لگا۔ صبح کی سپیدی جو مکانوں پر سے چمک رہی تھی مجھے ضرور مردہ تصور کر رہی ہوگی۔ جبھی تو اس قدر ساکن تھی۔ — ہم بازاروں میں سے گذرتے ہوئے چلے گئے کہ یکایک صبح کا نورانی سورج اچھی طرح چمک اُٹھا اور ایک سفید بادل میرے سامنے سے گذرا جس کے ساتھ ہی مجھے رات کی "ہا، ہو ہو!" یاد آ گئی۔

(۳)

اس نے جھوٹ بولا تھا۔ وہ نہیں آئی اور میں اس کا فضول انتظام کرتا رہا۔ آسمان پر سے ایک تاریک سوگوار اور گہری برودت کائنات پر چھا رہی تھی۔ مجھے احساس نہ ہو سکا کہ کس طرح شفق، شام کی تاریکی میں اور تاریکی رات کی خموشی میں تبدیل ہو گئی میرے لئے یہ سب ایک طویل رات کی برابر تھا۔

میں انتظار میں آہستہ آہستہ ٹہلتا رہا میں اس سڑک کی جادہ پیمائی کر رہا تھا جس میں اس کا مکان تھا اور جو اس وقت تک بند تھا۔ وہ اب تک مکان سے نہ نکلی تھی۔ اس نے جھوٹ بولا تھا۔

میں سڑک پر یوں ہی آتا جاتا رہا — کبھی اس دروازہ میں جھانکتا تھا جس کے شیشہ کے کواڑوں میں آہنی چھت کا عکس پڑتا تھا۔ کبھی سردی سے کپکپانے لگتا تھا۔ دفعتًا شمال کی جانب سے ایک سرد ہوا کا جھونکا اٹھا اور میرے چہرہ اور مکانوں کی چھتوں پر برف کے باریک ذرات بکھیرتا ہوا چلا گیا۔

سڑک کا لمپ اپنی زرد سوگوار روشنی کے ساتھ جھلملا رہا تھا۔ مجھے اس شعلہ پر ترس آیا جسکی عمر صرف ایک رات تھی۔ اور رات بھی سرد و سوگوار۔ میں سمجھ گیا کہ عمر یونہی کٹ جائیگی اور وہ کبھی نہ آئے گی — اس نے جھوٹ بولا تھا۔

میں سمجھتا تھا کہ میری اور اس لمپ کی حالت یکساں تھی۔ وہ بھی سوگوار تھا اور میں بھی فراق زدہ، فریب خوردہ۔ میں سڑک پر یونہی آتا جاتا رہا، اکثر لوگ میری طرف گھورنے لگے۔ اور پھر اپنی اپنی راہ لگ گئے۔ مگر وہ مکان سے

نہ کلی - میں بھی ناکام ٹہلتا رہا۔

مجھے تعجب ہے کہ اس آزمائش و ابتلا کے بعد میں چلّایا کیوں نہ اُٹھا اور اس تکلیف سے روکیوں نہ پڑا؟ میں سہم گیا۔ اور محسوس کرنے لگا کہ میری انگلیاں اور پنجے اکڑے جارہے ہیں۔ وہ اس زہریلے سانپ ۔۔۔ جھوٹ ۔۔۔ کو کچلنا چاہتے تھے جس نے مجھے دیوانہ وار اس سڑک کی پیمائش پر مجبور کر دیا تھا۔

ماضی اور حال، کے درمیان سے حجاب اُٹھ گیا، زندگی سے پہلے اور بعد کے درمیان سے سب رکاوٹیں دور ہوگئیں۔ "ہا، ہو ہو!" کی آوازیں کان میں بجتی ہوئی سُن رہا تھا۔

دفعتاً جب نظر اس کے مکان کی کھڑکیوں کی طرف پڑی تو ایسا معلوم ہوا کہ اس کی زرد اور نیلی روشنیاں مجھے یہ پیغام دے رہی تھیں :-

"کیوں فریب میں آرہا ہے! وہ تو جھوٹی ہے! جبکہ تو اس سخت کہر اور سردی میں سڑک پر ٹھٹھر رہا ہے۔ وہ اس شخص کے ساتھ جو تجھ سے نفرت کرتا ہے۔ اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی سرگوشیاں کر رہی ہے۔ اگر تو ہمت کر کے اُسے قتل کردے تو بڑا نیک کام کرنے یعنی دنیا سے جھوٹ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے!"

میں نے اس ہاتھ کی گرفت کسی قدر اور تنگ کی جس میں ایک لمبا چاقو تھا "ہاں! ہاں!! میں اُسے قتل ہی کروں گا!"

مگر کھڑکیاں میری طرف پھر مخاطب ہوتی ہوئی معلوم ہوئیں :-

"نادان! کیا تو سمجھتا ہے کہ یہ چاقو فریب نہیں دیگا! یہ بھی جھوٹا ہے بلکہ اُس کی محبت سے زیادہ جھوٹا!" بازار بالکل سنسان ہو گیا۔ ہر چیز ایک وہمی سایہ ہو گئی۔ اور میں یونہی ساکت کھڑا رہا۔ دور کے کلیسہ نے گھنٹہ بجایا۔ اس کی غمگین اور سوگوار آواز فضائے بسیط میں گونجی اور میں متحیر ہو گیا کیونکہ اس نے پندرہ بجائے تھے۔ "جھوٹ! کلیسہ کا گھنٹہ بھی خراب ہو گیا ۔۔ نہیں نہیں فریب دینے لگا! ہر طرف جھوٹ اور فریب مسلط تھا!

گھنٹہ کی آخری غلط ضرب ختم ہی ہوئی تھی کہ مکان کا دروازہ کھلا اور وہی دراز قد شخص خوش و خرم نکلا۔ میں اسکی صرف پشت دیکھ سکا مگر پہچان گیا۔ کیونکہ کل ہی تو اسے اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔

اسکی چال سے اس کی اندرونی مسرت بے پایاں کا اندازہ پوری طرح ہو سکتا تھا۔ میں بھی کبھی اسی گھر سے اسی طرح نکلا کرتا تھا اور کون ہے؟ جو ایک عورت کی پُر فریب محبت سے اس طرح مسرور ہو کر نہ نکلے!

(۳)

میں نے دھمکایا، سختی سے مطالبہ کیا اور دانت پیسے اور کہا "سچ بتاؤ!"

اس نے برف جیسے سفید چہرہ کو میری طرف پھیرا، جس کی متحیر پُر اسرار سیاہ آنکھیں میری طرف گڑی

ہوئی تھیں۔

"کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟" اس نے پوچھا

اسے خوب معلوم تھا کہ میں اسے جھوٹا ثابت نہیں کر سکتا تھا اور یہ کہ وہ میرے تمام شبہات، میری تمام تشویش ناک قوت تفتیش صرف ایک جھوٹے لفظ سے فنا کر سکتی تھی۔ چنانچہ وہ لفظ اسکے منھ سے نکلا۔ اور اپنی پوری نورانی سطح لئے ہوئے مگر اس کے نیچے سخت تاریکی تھی۔

"میں تم سے محبت کرتی ہوں! کیا تمہاری نہیں ہوں؟" وہ بالآخر بولی۔

سامنے کمرے سے ڈھکا ہوا میدان تھا جو تاریکی سے گھرا ہوا تھا۔ کمرہ میں آتشدان کی حرارت سے کافی آرام محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے ذرا سختی سے کہا: "سچ سچ بتاؤ! حقیقت مت چھپاؤ۔ خواہ وہ کتنی ہی اندوہناک کیوں نہ ہو۔ مجھے مرنا قبول ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ حقیقت نہ معلوم ہو! مجھے تمہاری آنکھوں میں فریب نظر آرہا ہے۔ بتادو۔ سچ بتادو۔ میں تمہیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ دوں گا!"

وہ خاموش رہی مگر آنکھوں کی سرد چبھن میرے سینہ میں پیوست ہوتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی سیاہ آنکھوں کی مستفسرانہ چمک میرے اعماقِ دل میں پہنچ رہی تھی اور میں اسے محسوس کر رہا تھا۔

"سچ بتادو ورنہ میں تمہیں قتل کردوں گا" میں نے چلا کر پوچھا۔

"مار دوگے!" اُس نے آہستہ سے کہا "مار ڈالو اکثر زندگی وبال جان ہو جاتی ہے۔ لیکن کیا تم سمجھتے ہو کہ اسطرح دھمکیاں دیکر مجھ سے حقیقت معلوم کرلوگے؟"

میں دوزانو ہو گیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر زور سے بھینچا اور چیخا: "خدا کے لئے مجھ پر رحم کر۔ رحم! —— سچ بتادے!"

"نادان — نادان!" اس نے محبت بھرے لہجہ میں کہا اور میرے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ "نادان"

"مجھ پر رحم کرو، جھوٹ نہ بولو، خدا کے لئے سچ بتادو!"

میں نے اس کی پیشانی کی طرف دیکھا۔ ایک مجنونانہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس پردے کے پیچھے صداقت چھپی ہوئی ہے۔ اس کا سر توڑ کر دیکھنا چاہیئے۔ اس میں کیا چھپا ہوا ہے۔ اُس کے نرم سینہ میں ضربات قلب صاف سُنائی دے رہے تھے۔ دل میں ایک طوفان اٹھا کہ اس جواب کی گہرائی میں حقیقت ضرور پنہاں ہوگی۔ اسے کھول کر دیکھ — دیکھ انسانی قلب کو عُریاں کرکے دیکھ!

کمرہ تاریک ہو رہا تھا۔ زرد شمع اپنے آخری لمحات پورے کر رہی تھی۔ اس وقت یہاں ایسا سکوت، ایسا

سوگ اور ایسی تاریکی تھی کہ دل میں خوف، غم اور تاثرات پے بہ پے پیدا ہو رہے تھے۔

"نادان ـــــ نادان!" وہ بولی۔

دفعتاً شمع بجھ گئی۔ کمرہ بالکل تاریک ہو گیا۔ میں اس کا چہرہ، اُسکی آنکھیں اور بازو مطلق نہ دیکھ سکتا تھا یکایک اس نے اپنی باہیں میرے گرد حمائل کر دیں اور میں نرم پڑ گیا۔ مجھے اس آغوش میں سچائی کا شائبہ نظر آتا تھا۔

تاریکی میں اس کی پُراسرار اور ڈراونی آواز سنائی دی:۔ "مجھے آغوش میں لے لو! مجھے ڈر لگ رہا ہے!"

پھر سکوت ایک حزیں اور سوگوار سکوت۔

"تم مجھ سے صداقت کے طالب ہو! لیکن کیا یہ میرے پاس ہے؟ خود مجھے ضرورت ہے کہ کوئی سچائی کی طرف رہنمائی کرے۔ میں جھوٹی نہیں ہوں۔ مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ!! اف! کس قدر خوفناک ہے!" وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔

کمرہ میں تاریکی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ کوئی کھڑکیوں میں سے ہماری طرف گھور رہا تھا وہ مجھ سے آ کر چمٹ گئی اور چیخی:۔ "آہ! کس قدر خوفناک ہے!!"

(۴)

میں نے اُسے قتل کر دیا۔ اس کا بے حس جسم اس کھڑکی کے نیچے پڑا ہوا تھا۔ جہاں سے میدان صاف نظر آتا تھا۔ میں نے اس کے ساکت جسم پر پاؤں رکھا اور ایک قہقہہ لگایا ـــــ یہ کوئی مجنونانہ قہقہہ نہ تھا۔ ہرگز نہیں یہ قہقہہ تھا اس مسرت کے اظہار کا، اس سکون قلب کے ثبوت کا جو مجھے آج محسوس ہو رہا تھا۔ آج میرا قلب پرسکون تھا، کیونکہ وہ ہستی جس نے میرے جسم و روح کو تباہ کر رکھا تھا آج فنا ہو گئی تھی۔

جھک کر میں نے اس کی بے حس آنکھوں کی طرف دیکھا۔ بڑی بڑی پُرسکون آنکھیں میری طرف گھور رہی تھیں۔ بے کیف اور سوگوار۔ میں نے اپنی انگلیوں سے ان آنکھوں کو کئی دفعہ کھولا اور بند کیا۔ اب مجھے ان سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ اب وہ پُراسرار اور فریب دہ نہیں رہی تھیں۔ اب میں خوش تھا۔

جب لوگوں نے مجھے پکڑ کر گرفتار کر لیا تو میں نے ایک قہقہہ لگایا۔ لوگوں نے اسے ایک وحشیانہ اور خوفناک چیز سمجھا۔ بعض کمزور لوگ ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ کچھ جرات کر کے میری طرف بڑھے لیکن میری مسرور نگاہوں اور خوش و خرم چہرہ کو دیکھا تو وہ زرد پڑ گئے اور انکے قدم چلتے چلتے ٹھہر گئے۔

"دیوانہ ہے!" کسی نے کہا۔

میرے خیال میں اس جملہ نے اُنکی تسلی کر دی کیونکہ وہ حیران تھے کہ ایک شخص اگر اپنی محبوبہ کو قتل کر کے قہقہہ لگائے تو سوائے دیوانگی کے اُسے اور کیا کہہ سکتے ہیں؟

ایک موٹے آدمی نے جو کسی قدر خوش طبع نظر آتا تھا۔ مجھے ایک اور لفظ سے یاد کیا جسے سُن کر میں کسی قدر

خاموش ہوگیا اور میری آنکھوں کے آگے ایک تاریک سایہ گرتا ہوا نظر آنے لگا۔

"ناداں" اس نے کہا تھا بالکل بے خیالی اور انتہائی خوش فکری کے ساتھ آہ! یا میں "ناداں" تھا؟

میں اُس شخص کی طرف دیکھکر چلایا اور لوگ ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ بعض یہ سمجھے میں اُنھیں بھی مارنا چاہتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں ان میں سے کسی کو چھونا تک نہ چاہتا تھا۔ بلکہ جب اُس نے میری طرف دوبارہ دیکھا تو میں نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

جب میں اس کمرہ سے جس میں لاش پڑی ہوئی تھی نکلنے لگا تو اس مرتے آدمی کی طرف دیکھ کر خطاب کیا" میں مسرور ہوں! بالکل مسرور اور بیحد خوش!"

اور یہ سچ تھا۔

(۵)

میں نے بچپن میں کسی چڑیا گھر میں ایک اژدہا دیکھا تھا اور اس نے میرے دل پر اس قدر گہرا نقش چھوڑا تھا کہ اب تک اُس کی یاد ذہن سے محو نہیں ہوئی تھی۔ وہ دوسرے جانوروں کی طرح دیکھنے والوں کی طرف غلامانہ انداز حماقت سے گھورا نہیں کرتا تھا بلکہ بالکل بے خیالی کی حالت میں اپنے پنجرہ میں اس طرح رینگتا تھا جیسے سنتری گشت کرتا ہے۔ ہمیشہ ایک مقررہ مقام پر پہونچ کر گھومتا تھا اور اپنی سنہری ناک ایک خاص سلاخ سے آکر لگاتا تھا۔ وہ اس طرح ہمیشہ کیا کرتا تھا اور لوگ اس باقاعدہ جانور کی حرکتوں کو دیکھکر مسکراتے تھے۔ بعض لوگ جانے کے بعد پھر لوٹتے تھے اور ایک دفعہ اسے پھر دیکھ کر اسکی غلامی اور اپنی آزادی کا خیال کر کے ایک آہ سرد بھرتے تھے۔ مگر وہ ان سب پرندوں سے مبرا تھا۔ اسے انکی ضرورت تھی وہ اپنے گشت میں مصروف رہتا تھا خواہ لوگ کچھ ہی کہا کریں۔ جب میں کسی کتاب میں یا کسی کی زبان سے" ابدیت" کا لفظ سنتا یا پڑھتا تو اس اژدہے کی زندگی سامنے آجاتی تھی اور پھر اس کی خوفناک اور سخت گیر نتائج کا احساس کر کے تھرا اُٹھتا تھا۔

میں اپنے" سنگین پنجرے" میں بالکل اس اژدہے کی مانند تھا۔ میں اپنے کمرہ میں برابر ٹہلتا رہتا تھا کبھی کسی کے استفسار کا جواب نہ دیتا تھا۔ ہر وقت اپنے خیالات میں مستغرق رہتا تھا۔ دماغ میں صرف ایک خیال قائم تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے کندھوں پر تمام دنیا رکھدی گئی تھی۔

یہ خیال صرف ایک لفظ پر مشتمل ہوتا تھا مگر کس قدر خوفناک اور دل کے پرخچے اُڑا دینے والا لفظ تھا! مہلک اور بیداد گر!

"جھوٹ!" ——— یہ تھا وہ لفظ

یہ لفظ ایک خوفناک سانپ میں تبدیل ہوگیا اور میرے گرد وپیش ہر وقت منڈلانے لگا۔ حتی کہ

مجھ سے چھوٹ گیا۔ اور میں ہر وقت اسکی پھنکار سننے لگا۔ میں پریشان تھا یہ خیال میرے لئے سوہان روح بن گیا تھا۔ دل سے جو آہ نکلتی تھی وہ ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے کوئی "جھوٹ" کا لفظ منہ سے نکال رہا ہو۔

میں کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کمرہ کا فرش غیر محسوس ہے اور چھت شفاف میں نے محسوس کیا کہ میں نکل کر فضائے بسیط میں پرواز کر رہا ہوں جہاں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔ میں بیتابانہ اوپر اڑا۔ مگر کمرہ میں پھر پھنکار کی آواز سنائی دی۔ یہ سب کیا تھا؟ میرے دل کی صدائے بازگشت، وہ آواز جس سے میں برافروختہ ہو جاتا تھا۔ یہ آواز تھی "جھوٹ"؟

میں نے کمرہ میں زور سے پاؤں مار کر چلانا شروع کیا۔ "جھوٹ! جھوٹ کہاں ہے، جھوٹ کو تو میں نے مار ڈالا!"

میں ارادتاً وہاں سے ہٹ گیا۔ کیونکہ خیال تھا کوئی سن کر اس چیخ کا جواب دے گا۔ مگر نہیں کمرہ کی دیواروں سے ٹکرا کر آواز گونجی —— "جھوٹ!"

آپ کو معلوم ہے۔ میں نے کیا غلطی کی تھی۔ گو میں نے اس عورت کو قتل کر دیا تھا مگر جھوٹ کو ابدی اور غیر فانی بنا دیا تھا —— جھوٹ دنیا سے اب بھی فنا نہیں ہوا۔ ایسی عورت کو اس وقت کبھی نہیں مارنا چاہئیے جب تک "صداقت" معلوم نہ ہو جائے، کوشش کرنا چاہیئے کہ وہ پھر راہ راست پر آجائے اور حقیقت کا انکشاف کر دے —— ورنہ قتل آخری تدبیر ہے۔

یہ خیالات تھے جو کمرہ میں ٹہلتے ہوئے میرے ذہن میں آرہے تھے!

(۴)

وہ اپنے ساتھ جھوٹ اور صداقت کو جس جگہ لیگئی ہے وہاں تاریکی ہے اور صرف تاریکی —— خوفناک اور ڈراؤنی تاریکی۔ جہاں میں بھی جانے والا ہوں شیطان کے عین تخت کے نیچے میں دو زانو ہو کر اسکا دامن پکڑونگا اور کہونگا —— "سچ بتا —— حقیقت کی طرف نہ چل۔ کیوں فریب دے رہی ہے"!

میرے خدا! میرے خدا! یہ بھی جھوٹ ہے! وہاں تاریکی ہی تاریکی ہے اور صدیوں کی کبھی نہ ختم ہونیوالی خاموشی وہ وہاں بھی نہیں ہے —— کہیں بھی نہیں ہے!

جھوٹ اب بھی باقی ہے۔ جھوٹ غیر فانی ہے۔ میں ہوا کے ہر ذرہ میں اسے دیکھ رہا ہوں اور جب میں اس فضا میں سانس لیتا ہوں تو سینہ میں ایک کھٹک ہوتی ہے اور چاہتی ہے کہ اسے چیر کر نکل جائے! آہ! انسان کیلئے صداقت کی تلاش کیسا مجنونانہ فعل ہے! کسقدر تکلیف دہ ہے حقیقت کی تلاش! اے خدا مجھے بچا! بچا!! —— جھوٹ ہے! کیا میں جھوٹا ہوں؟

(انڈریف)

ظفر قریشی دہلوی

حضرت ریاض آپ اپنے آئینہ ہیں

یوں تو، ہر وہ شخص، جسکو شاعری سے کچھ بھی لگاؤ ہے، نہ حضرت ریاض کے نام سے ناواقف ہوسکتا ہے اور نہ ان کے رنگ کلام سے بیخبر، لیکن خود ریاض کیا چیز ہیں۔ اسکے جاننے والے وہی لوگ ہوسکتے ہیں جن کو اس "رند پاکباز" سے ملنے اور بار بار ملنے کا فخر حاصل ہوا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کا شاعر، جیسا کہ اس سے قبل میں بارہا ظاہر کر چکا ہوں، بہ حیثیت انسان ہونے کے ایک ایسی جنس فرومایہ ہے کہ مشکل ہی سے کسی کو اس کے پیش کرنے کی جرأت ہوسکتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر واقعی کوئی انسان اس گروہ میں نکل آیا تو پھر اس کا جواب اس "عالم آب و گل" کیا معنی "ملائکہ مقربین" اور "کروبیان مقدسین" کی جماعت میں بھی نہیں مل سکتا۔

اس حقیقت کی طرف اول اول میرا خیال اس وقت منتقل ہوا جب غالباً ۲۵ء میں سب سے پہلے ریاض کی زیارت کا شرف بھوپال میں مجھے حاصل ہوا اور پھر اس حقیقت کے مدارج رفتہ رفتہ مجھ پر اس وقت واضح ہوئے جب میں لکھنؤ آگیا اور زیادہ قرب کے ساتھ، بار بار، رات دن کے مختلف حصوں اور متنوع کیفیات رکھنے والی صحبتوں میں ریاض کے مطالعہ کی فرصت نصیب ہوئی۔

ریاض کیا چیز ہیں؟ اگر میں تفصیل سے کام لوں تو اس کے لئے دفتر کے دفتر ناکافی ہیں، لیکن اختصار و اجمال کے ساتھ اگر کوئی دریافت کرے تو میں اس کے جواب میں وہی کہہ سکتا ہوں جو یوسف کی خصوصیات معلوم کرنے کے بعد بعض زبانوں سے بے اختیار نکل گیا تھا کہ

ان ھذا الا ملک کریم

اور اس کے بعد بھی عرفی کا یہ مصرعہ پڑھوں گا کہ

مرغ اوصاف تو از اوج بیاں انداختہ

کیونکہ یوسف تو خیر، پیغمبر پیدا ہوئے، پیغمبر زندہ رہے اور پیغمبر مرے، اور ان کے لئے ملک کریم ہو جانا کوئی امتیاز نہ تھا، لیکن ریاض تو بقول شخصے اس "تیرہ خاکدان ہند" میں ایک گنہگار انسانی خاندان میں پیدا ہوئے، اور جوانی کا معصیت کوش زمانہ اس فضا میں بسر کیا جہاں "حسن" کا مفہوم "استغناء"

نہ تھا اور اب ضعیفی ان حالات کے ماتحت گزار رہے ہیں۔ جب "ممنوعات ومحرمات" کا سوال شرعاً و قانوناً دونوں طرح اُٹھ جاتا ہے۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ریاضؔ اپنی زندگی کی کسی منزل میں اپنی حیات کے کسی مشغلہ میں اور اپنی عمر کے کسی موسم میں ایک لمحہ کے لئے بھی اُس جادۂ انسانیت واخلاق سے ہٹے ہوئے نظر آئے، جو کبھی کبھی گنہگاروں کو تو ملجاتا ہے، لیکن "زاہدانِ مرتاض" کے حصہ میں کبھی نہیں آتا اس لئے اگر ان کو ملک کریم کہنے کے بعد بھی عُرفی کی طرح اعتراف قصور کیا جائے تو غالباً نادرست نہوگا۔

ریاضؔ اس عہد کی یادگار ہیں جب اودھ اور مضافات اودھ کے اکثر مقامات میں زندگی کا مفہوم باوجود انتزاع سلطنت کے بدستور خندہ وقہقہہ چلا آرہا تھا اور ہر صحبت اس احساس حسن وشباب کا مکمل نمونہ ہوتی تھی، جسے شعر وموسیقی کا خلاق کہنا چاہیئے

یہ وہ زمانہ تھا۔ جب ہر اجتماع ہنگامہ نائے ونوش تھا اور ہر منظر بساطِ گلفروش۔ بیفکریاں تھیں اور عیش کوشیاں عیش کوشیاں بھی تھیں اور ان اسباب کے ساتھ جن کا ایک ادنےٰ منظر صاحب رسائل طغرا کی زبان میں "بہر سی بنا گوشش مطربان جلاجل نعل در آتش" کے تیور لئے ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص پر ایسے مہوش اور مدہوش کن زمانہ میں جوانی آئے اور شخص بھی کون؟ ریاضؔ ایسا فطرت کی طرف سے غیر معمولی طبع رنگیں رکھنے والا وہ جس قدر دادِ معصیت دیتا کم تھا، لیکن اس کا علم بہت کم لوگوں کو ہوگا کہ یہ ساری عمر خمریات کی شاعری میں مبتلا رہ کر ذوق بادہ سے نا آشنا رہنے والا شاعر، یہ زندگی کی تمام شگفتہ سامانیوں کے ساتھ حسن وشباب کے ہجوم میں بہترین ایام حیات گزارتے ہوئے جادۂ اخلاق سے کبھی ایک لمحہ کے لئے نہ ہٹنے والا شخص، جس طرح ایک انسان پیدا ہوا تھا، بدستور اسی طرح انسان رہا اُس زمانہ میں بھی جبکہ گناہ سے پہلے عذر گناہ پیدا ہوجاتا ہے، اس سنِ کہولت کا کیا ذکر کہ اب تو ریاضؔ حقیقی معنے میں رضواں ہے۔

ریاضؔ موجودہ حالت میں ضعف وکہولت کے جس دور سے گزر رہے ہیں وہ اس تصویر سے ظاہر ہے جو اس مضمون کے ساتھ شائع ہورہی ہے لیکن باوجود اس کے کہ زمانہ موافق نہیں، حالات نے سخت دلگیر بنا رکھا ہے، ہجوم افکار نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے، ریاضؔ باوجود سراپا غم والم ہونیکے اب بھی دوسروں کے لئے، یکسر بہار وشگفتگی ہے، آپ خواہ کتنے ہی مغموم وملول کیوں نہ ہوں، لیکن یہ ممکن نہیں کہ ریاضؔ آپ کو مل جائیں اور تھوڑی دیر کے لئے آپ کسی اور عالم میں نہ پہنچ جائیں، ان کی دلکش ودلنشیں گفتگو، ان کا انداز بیان، ان کی لطیف بذلہ سنجیاں اور پھر سب سے بڑھکر انکا خلوص ــ یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کسی ایسی فضا میں پہنچ گیا ہے، جہاں فردوس کی ہوا ہے، کوثر وسلسبیل کی روانی ہے

اورشجر طوبیٰ کے طیور کا ترنم! بچوں کے لئے انکے وجود گہوارۂ استراحت جوانوں کے لئے اُن کی ہستی داستان حسن وعشق اور ضعیفوں کے لئے ان کی ذات ایک برادرانہ آغوش ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص ریاض سے ملے اور اپنے ذوق کو اُنکے پاس سے "ناآسودہ" واپس لائے۔

چونکہ ریاض نے اس زمانہ میں ہوش سنبھالا، جب لکھنوی شاعری شباب پر تھی اور داغ نے بھی دلی کے رنگ سخن کو چمکا رکھا تھا ہر صحبت، صحبت شعروسخن تھی اور ہر بزم دائرۂ شمع ولگن۔ رام پور میں خلد آشیاں نواب کلب علی خاں کے دربار میں ملک کے تمام اکابر شعراء کا ہجوم تھا، ہر محفل لطائف ادبیہ اور نکات شعریہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ اور ریاض بھی ان گلدستوں میں ایک گلِ نو میدہ کی حیثیت سے کہیں نہ کہیں ضرور پائے جاتے تھے اس لئے آج۔ ریاض کے سوا کوئی نہیں جو ان محافل کی داستان کا بیان کرنے والا ہو اور صرف انھیں کا سینہ ہے جس کے اندر خدا معلوم کتنے واقعات اُس دورِ زریں کے محفوظ ہیں۔ اب سے دو سال قبل ریاض کے اوقات کا اکثر حصہ لکھنؤ میں بسر ہوتا تھا۔ میں نے سید امتیاز احمد بی۔ اے مرحوم (آہ امتیاز!) سے بارہا کہا کہ وہ ریاض سے ان جواہر کو حاصل کر کے کسی نہ کسی طرح محفوظ کر لیں اور چونکہ وہ شب روز ریاض ہی کی معیت میں رہتے تھے، اور ہر وقت انکی گل افشانیوں سے لطف اندوز رہتے تھے۔ اس لئے انکے لئے زیادہ دشوار نہ تھا۔ مگر یہ خوش بختی میرے لئے دوسری طرح مقسوم ہو چکی تھی اور وہ یوں کہ خود ریاض اپنے ہی ہاتھوں سے یہ نقشیں نگار کو ارزانی فرمائیں گے اور اس طرح "شاہد ومشہود ومشاہدہ" سب کا امتیاز اُٹھ کر یہ حقائق رونما ہونگے۔

ریاض شاعر ہونے کی حیثیت سے کس مرتبہ کے مالک ہیں اور لکھنؤ اسکول کی شاعری میں وہ کس امتیاز وخصوصیت کے حامل ہیں؟ اس کا ذکر اس جگہ بے محل ہے۔ علاوہ اس کے یوں بھی میں نگار میں ایک بار اس مسئلہ پر گفتگو کر چکا ہوں۔ لیکن یہاں یہ ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ ریاض کس مرتبہ کے انشا پرداز ہیں۔ کیونکہ اب زمانہ اس بات کو محو کر چلا ہے کہ ریاض کسی وقت اس خصوصیت کے لحاظ سے بھی خاص مرتبہ رکھتے تھے اور یہ فراموش کاری کس قدر دردناک ہے کہ آج وہ لوگ جو انتہائی دعوائے تحقیق وتفتیش کے ساتھ تاریخ زبان اُردو لکھتے ہیں وہ بھی ریاض اور اُنکے لٹریچر سے بحث نہیں کرتے، حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ جس وقت سرسید مرحوم تہذیب الاخلاق کے ذریعہ سے اصلاح مذہب کا لٹریچر پیش کر رہے تھے اور خان بہادر میر ناصر علی چودھویں صدی کی وساطت سے علمی مناظرہ کی شان پیدا کر رہے تھے، اس وقت ریاض ۱۸۷۶ء میں ریاض الاخبار، گلکدہ ریاض، فتنہ وعطر فتنہ نکال کر اور پھر ۱۸۸۵ء میں روزانہ صلح کل کا اجراء کر کے، نثر ونظم کا وہ خزانہ لٹا رہے تھے،

جو انھیں کے لئے مخصوص تھا اور انھیں کے ولولۂ عمل کے ساتھ وہ بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ کیسے خوش قسمت ہیں وہ جن کے پاس ان سب کا مکمل فائل موجود ہے، اور کس قدر قابل رشک ہیں وہ جنھیں اب بھی گاہ گاہ ریاضؔ کی زیارت نصیب ہو جاتی ہے اور ان کی زبان سے وہ لٹریچر سننے میں آجاتا ہے جس کے دیکھنے کو دنیا کی آنکھیں ترس ترس کر آخر کار مایوس ہو گئیں۔

پھر نگار اپنی خوش بختی پر جتنا ناز کرے کم ہے کہ وہ آج ریاضؔ کو (شاعر ریاضؔ نہیں) ادیب و نثار ریاضؔ کو پھر منصۂ شہود پر لا رہا ہے اور ان جواہر ریزوں کو وقف عام کر دینا چاہتا ہے جو سوائے اس کے کسی اور صورت سے حاصل ہی نہ کئے جا سکتے تھے کہ خود ریاضؔ اپنے حافظہ سے نکال کر صفحۂ کاغذ پر منتشر کر دیں۔

آپ اس سلسلہ میں یقیناً کسی ترتیب تاریخی کا لحاظ نہ پائیں گے اور نہ مورخانہ اعداد و شمار آپ کو اس میں نظر آئیں گے۔ بلکہ یہ وہ موتی ہیں جو بغیر کسی نظم و اصول کے حضرت ریاضؔ نے بکھیر دئے ہیں۔ اب آپ کو اختیار ہے خواہ انھیں پرو کر کوئی ہار بنا لیں یا یوں ہی منتشر حالت میں ان کی درخشانی سے لطف اندوز ہوں۔

اس سلسلہ کی پہلی قسط نگار کی اس اشاعت میں درج کی جاتی ہے اور یقین ہے کہ یہ سلسلہ اس وقت تک ختم نہ ہوگا جب تک ریاضؔ کے خزینۂ دماغ کا آخری جواہر ریزہ کسی نہ کسی طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ پس اگر میں اس جنس گرانمایہ کو پیش کر کے یہ کہنے کا مجاز ہوں کہ

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم،

تو ریاضؔ اور ان کے لٹریچر کو دوبارہ زندہ کرنے کے عوض میں نگار کا بھی آپ سے یہ مطالبہ غالباً خلاف محل نہ ہوگا کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم آپ اس کے متعلق

"الیس ذالک بقادر علی ان یحیی الموتی"

کے تو قائل ہو جائیں۔

نیاز

شوخ نگار، مدیر نگار، پیارے نیاز میرے لئے سرمایۂ ناز۔ پرسوں نگار آیا۔ مجھے فوراً بھولا ہوا وعدہ یاد آیا اور میں تعمیل ارشاد میں مصروف ہوا۔ جاڑوں کی لمبی راتیں کام آئیں اور میں یہ کہنے کے قابل ہوا۔

سپردم بتو نامۂ خویش را تو دانی حساب کم و بیش را

ناتمام مراسلہ بھیج رہا ہوں۔ بدقسمت بھی ہوں۔ بدخط بھی۔ مجھ سے اپنا لکھا خود نہیں پڑھا جاتا۔ حرف نہیں تحریر قسمت کی آڑی ترچھی لکیریں ہیں۔ خدا کرے آپ پڑھ لیں۔ نقل کے لئے وقت کافی نہیں۔ آپ میرا یہ مراسلہ مجھے واپس

دینے کو با احتیاط رکھ لیں۔جواب کی ضرورت نہیں ہے غالباً جلد لکھنؤ اس لئے آؤں گا کہ ہلال صیام نبکر میں زار و ناتواں خیرآباد واپس آ جاؤں۔ ماہ مبارک کا آغاز لکھنؤ میں نہ ہونے پائے۔بھوک کا مزا گھر پر لطف دیتا ہے ۔ ریاض

مرے ہوئے پڑے رہتے ہیں رات دن گویا
ہماری عمر میں شاید مہِ صیام نہیں۔

روزہ داروں کی رات مزے کی ہوتی ہے۔میں نے خود کہا ہے

روزے نہیں ہیں سخت یہ سب باتیں ہیں
ہاں لطف فزا شب کی ملاقاتیں ہیں

یاروں میں مہِ صوم کی تعریف یہ ہے
کچھ ہجر کے دن وصل کی کچھ راتیں ہیں،

مگر مجھ سے مفلس گرسنہ کے لئے رات دن برابر۔ مرے ہوئے پڑے رہنا اچھا کہ مہ صیام شمار عمر میں نہ رہے۔
بچوں کو دعا۔گھر میں مزاج پرسی۔ ریاض ۱۶ر جنوری ۱۹۳۱ء

نیاز صاحب۔آپ میری تصویر کو بڑھاپے میں روشناس خلق یا رسوائے عالم کرنا چاہتے ہیں

میں پھرا اس در سے تو خلقت تماشائی ہوئی
آگے آگے داغ پیچھے پیچھے رسوائی ہوئی۔

میں خود اپنی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتا اور رنگی نسبت کیا عرض کروں وہ دن گئے

دنیا کی پڑ رہی ہیں نگاہیں ریاض پر
کس وضع کا جوان ہے کس آن بان کا

یہ کہنے کا موقعہ کہاں

تم جوانی کے مزے لو تو ریاض
عیب بھی زیبا ہے اس سن کے لئے

اب تو میرے لئے ہر ایک کو مجبوراً یہ کہنا پڑے گا ع

جنت میں بھی یہ جا کے جواں ہو نہیں سکتا

گو بڑھاپے کی بڑھتی ہوئی ہوس اس عمر میں بھی یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے

دے پیر مغاں دختر رز عمر رسیدہ
بوڑھا ہوں ملے نور نظر چرخ کہن کی،

وہ زمانہ بھی غنیمت تھا جب دھوپ چھاں یا نیم سپید ریش کسی کے دست حنائی سے رنگ حنائی کی خواستگار ہوتی تھی، اور کسی موقع پر خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی لکھنوی سے یہ سننا پڑا تھا

حنا لگا کے پہنچتے ہیں کل خوں میں ریاض
کچھ ان کی ریش مبارک کا اعتبار نہیں

یا خداوند نعمت حضور مہاراجہ صاحب بہادر بالقابہ والی محمود آباد دو مہ صورت دیکھتے ہی ارشاد فرمایا کرتے تھے

بڑے نیک طینت بڑے صاف باطن
ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں،

خود بھی رنگینی خضاب کے اسباب فراہم کرکے شوق خضاب میں کہنا پڑتا تھا ؎

خوب ہیں شاہدان بازاری　　ہم سیہ کاردہ خضاب فروش،

دیکھیے کالا منہ کرنے کے محاورے کو کس حسن سے ادا کیا ہے۔ ایسے ابتذال پر غیر مبتذل صدہا شعر صدقے آپ بھی غالباً قدر کریں گے گو بہ اعتبار ریش گوری کالی یعنی سیاہ و سفید دونوں سے آپ بے نیاز ہیں۔

کالی گوری کے مبتذل استعمال نے اس وقت ایک شعر بے محل اور ریش سے غیر متعلق یاد دلوایا۔ شاید اُتری جوانی اور ریش آہن کردہ سے گونہ دور کا تعلق ہو آپ جبین پر بل ڈال کر بادلِ ناخواستہ وہ میرا مبتذل شعر بھی سن لیجیے مگر کوشش فرمائیے گا کہ میرے قدردان مہربان مولوی عبدالسلام صاحب ندوی مولف شعر الہند تک نہ پہنچنے پائے ؎

کالی گوری کوئی نہ چھوٹی،　　افیوں کھا کر، پی لی۔ توبہ،

آپ اُس زمانے میں تصویر شائع کر رہے ہیں جب ریش سفید پر کوئی رنگ ہی نہیں چڑھتا نہ ساون کی مہندی کام دیتی ہے نہ کسی شوخ کے لب نازک سے شراب کی کلیاں۔

اب ریش سفید نے درازی عمر شیخوخیت سے زیادہ اعتبار پیدا کر لیا ہے۔

کبھی کبھی دوران بچہ و بدخرگوشتے بھی سُن لینا پڑا ہے مگر قصر نماز کی طرح قصر ریش کی طرف طبیعت مائل نہ ہوئی۔

اس وقت ریش مبارک کے ذکر میں ایک غیر متعلق قصہ عنفوان شباب یا اُس سے کچھ پہلے کا یاد آگیا اُسے بھی سُن لیجیے۔ اب تو بہ اعتبار ریش و بروت یہ کہنے کے بھی قابل نہیں ہوں ؎

تشنہ تھا مراشباب پی لی　　بھیگیں جو مسیں شراب پی لی،

یہ وہی زمانہ ہے کہ بغیر شراب کے مسیں بھیگ رہی تھیں۔

واقعہ یہ ہے۔ لکھنؤ میں کسی تقریب سرکاری کے ذریعہ سے کچھ والیان ملک بھی آئے تھے۔ داروغہ عباس علی مرحوم انجینیر و یکتائے فن فوٹوگرافر کے دولت خانے پر جس کا اب نشان تک نہیں ہے۔ چند مقتدر نوابین و رؤسائے شہر تشریف فرما تھے۔ منشی نولکشور آنجہانی بھی موجود تھے اور میں بھی۔ کہ ایک رئیس با اختیار مع مختصر اسٹاف کے مرغ زریں بنے۔ آتے نظر آئے۔ اطلاع کے ساتھ ہی سب حضرات تعظیماً استقبال کے لئے بہ عجلت بڑھے۔ دیکھا کہ ریش دونوں جانب پائے پر چڑھی ہوئی۔ شکل مشتبہ۔ چہرہ غضبناک نہ سلام میں خود سبقت کی نہ سلام کا جواب دیا۔ زبان پر لکھنؤ کا نام اور صدہا صلواتیں۔ لعنت اور پھٹکار کی بار بار تکرار اس طرح مقام نشست تک تشریف لائے۔ اور باوصف تلخ گوئی اعزاز کے ساتھ بٹھائے گئے۔ مگر گفتار اور کردار و لہجے میں فرق نہ آیا۔ مزاج پرسی کی جرأت کون

کر سکتا تھا۔ وہ البتہ سخنہائے درشت سے مزاج پرسی فرمائے جاتے تھے کچھ دیر کے بعد جب زبان تالو سے لگی۔ تو ایک سن رسیدہ گرم و سرد دیدہ نواب صاحب نے بہ ادب عرض کیا۔ لکھنؤ سے برافروختگی کا سبب معلوم ہو تو ہم بھی ہم نوا ہونے کی جرات کریں۔ فرمایا یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ اسلامی شہر مگر جیسے دیکھئے داڑھی صاف مسلمان و غیر مسلمان میں امتیاز نہیں نہ مصافحہ و معانقہ کا موقع نہ سلام علیکم کا۔ ساتھ ہی پھر لعنت کی تکرار سلسلہ ٹوٹنے پر حسن نواب صاحب نے عرض کیا۔ برافروختگی کا سبب تو معلوم ہو گیا مگر حضور نے خود سبب نہ دریافت فرمایا۔ بہ ادب عرض کرتا ہوں۔ سنئے۔

غدر سے پہلے میں بھی اور سب مسلمانان لکھنؤ بھی۔ ریش کے رکھوانے میں آپ ہی کے مقلد تھے۔ ایک روز میں خط بنوا رہا تھا۔ آئینے پر نظر تھی۔ اطلاع پر اطلاع مسجدوں امام باڑوں کے منہدم کئے جانے اور بے احتیاطی برتنے کی آ رہی تھی دفعتاً یہ اطلاع ملی کہ نواب آصف الدولہ کا مشہور امام باڑہ اور اسکی وسیع و حسین مسجد گھوڑوں کی اصطبل بنا دی گئی نہ روک تھام کی طاقت تھی نہ انتقام کی۔ میں نے مشتعل ہو کر خاص تراش سے کہا کہ ریش ترک کر مسلمان صورت رہوں اور یہ خبریں سنوں۔ تو اسے صاف کر دے۔ اس کے بعد ہی ریاض صاحب کی طرف ہاتھ بڑھا کر لعنت ہے اس داڑھی پر۔ پھٹکار ہے اس داڑھی پر۔ جواب میں خاموشی تھی اور سناٹا۔ وہ سین اس وقت تک خیال کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ حسن نواب صاحب کے دندان شکن جواب سے بہتر جواب ایسے کج خلق ریش کے لئے کیا ہو سکتا تھا۔ میں ڈر رہا ہوں مبادا اہل اور سجدہ داران کا سا طعنہ مسلمانوں کی ریش مبارک پر حملہ نہ کرے اور میری ریش مبارک پر بھی نہ بن جائے میں نے تو اس امید پر اسے لگا رکھا ہے کہ ع

خدا شرم دارد ز موئے سفید

ناظرین نگار۔ تصویر کو صرف میرے اشعار دیکھنا چاہیئے نہ کہ مجھے سے

کہتا تھا اگر خوں سے ریاض شکستہ حال　　مجھ کو نہ دیکھئے مرے اشعار دیکھئے

یہ سنتے ہی۔ میری تصویر یقیناً نظروں سے گر جائے گی اور مذہبی تاریک نقطۂ نظر سے۔ تصویر کھنچوانے کے جرم میں۔ میں بھی۔ سب سے اشعار زیادہ حصہ ان کا بھی تاریک ہے۔ خدا کرے یہ بھی ناظرین کی آنکھ کا نور بنے۔ اور کبھی نظر سے نہ گرے۔ میں شعر صرف اپنے لئے کہتا ہوں جو ایسا نہیں سمجھتے ان کو اپنے مذاق کے خلاف خواہ وہ مبتذل اشعار ہوں یا عریاں۔ موقع اور محل کے لحاظ سے ضرورتاً استعمال کرنا چاہیئے ورنہ تضیع وقت اور ادنیٰ مبتذل عریاں مذاق کا ثبوت ہے۔ ع

ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مقامے دارد

ابھی عرض کر چکا ہوں۔ ع

کالی گوری کوئی نہ چھوڑی،

جو مبتذل بھی ہے اور عریاں بھی۔ مگر دوسرے مصرع نے نہ ابتذال باقی رکھا نہ عریانی۔ ضرب المثل کا موقع سے استعمال ہو گیا اور لغت نگاروں کے لئے سند کی دقت رفع ہو گئی۔ میں نے یہ مثالاً کہا نہ کہ اس خیال سے کہ میرے اشعار سند کا کام دینگے۔ دوسری مثال امیر مینائی کے کلام سے پیش کرتا ہوں۔ ارشاد فرماتے ہیں۔ ع سینے پہ چڑھ کے جتنے کیا پیار کیا ہوا اس سے زیادہ ابتذال اور عریانی کیا ہو سکتی ہے۔ یہ کمال شاعری ہے کہ مصرع اول نے ابتذال و عریانی رفع کر کے شعر کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ مصرع اول سننے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مصرع مبتذل کے لئے مصرع بہم پہنچانا ناممکن تھا۔ نہ اب قوت شعری کوئی دوسرا مصرع بہم پہنچانے کے لئے کارفرما ہو سکتی ہے۔ اب مصرع اول کے ساتھ دوسرا مصرع ملاحظہ فرمائیے ؎

سینے پہ چڑھ کے جتنے کیا پیار کیا ہوا اترا ہوا گلے کا ترے ہار کیا ہوا

جناب داغؔ ارشاد فرماتے ہیں ؎

مٹی کی بھی بنے تو روا ہے شباب میں ایسے کو تو خدا کی قسم چھوڑنا ہے کفر

یہ شعر داغؔ صاحب موزوں نہ فرماتے تو ضرب المثل کے لئے سند کا ملنا دقت سے خالی نہ تھا۔ واقعاتی اسلوب بیان لیا ہے کہ باوصف ابتذال اوہر سنا اوہر یاد ہو گیا۔ قسم شاہد پرستی کے اعتبار سے ہے یا اثر حسن و شباب کا تقاضا طبیعت پر قابو نہ رہنے کی حالت میں وہی اثر قسم کے استعمال کا حامی ہے۔ یہ شعر خود ہی اجازت نہیں دیتا کہ بے محل اس کو زبان پر لائے۔ اس کا ابتذال بے محل سنانے والے کے لئے الزامی صورت پیدا کرتا ہے۔ نہ کہ کہنے والے کے لئے۔

غالبؔ کا شعر ملاحظہ فرمائیے۔ جس کا مسلمہ صحیح مذاق سخن اور پاکیزگی زبان و قدرت بیان اور ہمیں کم پائی جاتی ہے۔ ؎

ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں

قدرت بیان نے بیساختہ زبان کے اتفاقی واقعات نے اس سخت قافئے کو موزوں کرنے میں۔ شاعری کے کمال فن کو ظاہر کر دیا۔ علیٰ ہذا مستند شعرائے مقدمین متاخرین کے کلام میں ایسے ابتذال و عریانی کے اشعار بھی پائے جائینگے۔

مجھے کہنا صرف یہ تھا کہ میں شعر اپنے لئے کہتا ہوں اگر اور لوگ بھی لطف اندوز ہونے میں اپنا حق سمجھتے ہیں تو بہ اعتبار موقع و محل انکا استعمال کریں ورنہ الزام انکے سر۔ انکی خاطر سے۔ اخلاقی طور پر میں اپنے سر ہی۔ مبتذل گوئی ولغو گوئی کا الزام نے لونگا اور آفریں کے عوض نفریں کو اپنا حصہ سمجھونگا۔ ؎ ریاضؔ

نفرینِ ناشناس کا ہم کیوں گلہ کریں تحسین ناشناس کا صائب ہے شکوہ سنج

مجھے اس وقت دور حاضر کے مہذب تعلیم یافتہ شعرا کے مذاق اور زبان شعری سے بحث نہیں ہے وہ صحیح ارتقائی حالت میں ہو یا اسکے برعکس۔ مجھکو دور آخر کے مستند اساتذہ و ثقات شعرا سے ملنے اور مستفید ہونے کا اتفاق ہوا ہے۔ انکے لطیف اشعار کا تو کیا ذکر انکی ہر بات نقش دل ہے۔ میں نے انکے مذاق شعری میں۔ عاشقانہ رنگ ہو۔

یا صوفیانہ۔ یہاں تک کہ سوقیانہ بھی بہ اعتبار نوعیت کلام قریب قریب یکسانیت دیکھی۔ گو کہنے کا جادہ جدا ہوتا تھا۔ انکی انتخابی یکسانیت نے جو متقدمین کے تتبع سے علحدہ نہ تھی۔ صحیح مذاق سخن کا معیار ہمیشہ کے لئے میرے خیال میں پیدا کردیا ہے۔ موجودہ دور میں۔ مغربی شعری مذاق نے احترامی تغیرات ضرور پیدا کئے جن سے نظم و نثر دونوں میں ارتقائی شان کا خاص رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ اب ہندی نا مانوس الفاظ کی جدید آمیزش کا زیادہ تر حصہ اسی طرح دکنی اختراعی اصطلاحات (جو مستند اہل زبان کے اتفاق رائے کے غالباً محتاج ہے) ٹکسالی اردو پر کب تک اور کہاں تک اثر ڈالیں گے ابھی نہیں کہا جاسکتا اور وہ جگہ حاصل کرنے کے بعد دیرپا بھی ہوگا یا نہیں۔ تراجم کے خصوصیات اور اخباری زبان کی امتیاز ہمہ گیر وسعت آیندہ یہ ترقی جو صورت ٹکسالی اردو کے لئے اختیار کرے۔ بہ اعتبار بلندی مضامین نہ پاکیزگی تخیل ٹکسالی خصوصیات چھوڑکر اردو زبان بہت کچھ سرمایہ دار ہوگئی ہے خدا کرے صحیح زبان اور صحیح مذاق سے جو یگانگی یا بے نیازی پائی جاتی ہے وہ جاتی رہے کاش انگریزی مذاق و خیالات کے متبع حضرات ایسے اشعار موزوں کرنیکی طرف اور زیادہ توجہ کو دخل دیں جو مغربی اور ایشیائی مذاق دونوں میں اعلےٰ درجہ مقبولیت حاصل کریں۔

مجھے یاد ہے۔ غازیپور میں شاہ احمد اللہ مرحوم سب جج اور شاہ امجد اللہ مرحوم منصف کے دولت خانے پر چند معزز حضرات بی۔ اے۔ ایم۔ اے پاس تشریف فرما تھے۔ ایشیائی شاعری کے متعلق کسی قدر برے پہلو کو لئے ہوئے اظہار خیالات ہو رہا تھا۔

میں نے عرض کیا۔ میرانیس مرحوم و مغفور کے نیچرل مناظر کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ میں امیر مینائی کا ایک شعر سنانا چاہتا ہوں۔ شاید وہ اس صحبت میں درجہ قبولیت حاصل کرے اور آپ حضرات اس سے بہتر یا اس کے برابر کسی انگریزی شعر کے ترجمہ سے مجھے ممنون فرمائیں۔

اجازت ملنے پر میں نے یہ شعر سنایا ؎

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں
بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

میں نہیں کہہ سکتا سننے والوں پر کب تک وجد کی حالت طاری رہی۔ ممکن ہے یہ صورت میرے بتانے کے لئے اختیار کی گئی ہو۔ کبھی کبھی شعرا کے قلم سے۔ ایسے شعر نکل جاتے ہیں جو مغربی مذاق سے خراج تحسین حاصل کرتے ہیں۔

تقریباً بتیس سال سے زیادہ زمانہ ہوا کہ میرا ایک شعر کسی ولایت کے اخبار میں کسی خاص وجہ سے درج ہوگیا جسے پائنیر نے بھی اور سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور نے بھی لیا۔ یہ اتفاق ہے کہ سول اینڈ ملٹری گزٹ کا وہ ترجمہ خان بہادر سید ناصر علی خانصاحب حال پنشنر انسپکٹر ٹنک مالک صلائے عام دہلی کی نظر سے گذرا۔ ممدوح نے وہ شعر اور اوس کا نوٹ تراش کر مجھے بھیجدیا۔ اور اس کے ساتھ جو الفاظ مجھے لکھے۔ میں انھیں مایۂ ناز سمجھا۔ متعدد خطوط بھی

انگریزی داں حضرات کے میرے پاس آئے۔ اور خاص الفاظ سے میری عزت افزائی کی گئی۔

برسبیل تذکرہ وہ شعر ذیل میں درج کئے دیتا ہوں۔ ممکن ہے آپ کو بھی پسند آئے اور پسند فرمانے میں میرے لئے اخلاقی رعایت سے کام نہ لیا جائے ؎

عالم ہو میں کچھ آواز سی آجاتی ہے
چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا،

میں نے آپ کا بہت وقت ضائع کیا اور ابھی کچھ اور ضائع کرنا چاہتا ہوں۔ شعری مذاق صحیح کی نسبت اوپر کچھ عرض کر چکا ہوں۔ چاہتا ہوں تین چار شعر مذاق صحیح کے ثبوت میں پیش کروں۔

جس زمانہ میں، ریاض اخبار ہفتہ وار اور گلکدہ ریاض ماہوار خیرآباد سے شائع ہوتا تھا اور رحیم کے مطبع کا تاریخی نام لمعۂ رخشاں تھا۔

اعلےٰ حضور جناب نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں نے مجھے میرے استاد حضرت امیر مینائی مرحوم ومغفور کے ذریعے سے یاد فرمایا۔ میں اُس وقت دربار قیصری میں شرکت کے لئے دہلی جانے کو شدت سے بیتاب تھا۔ اس پہلے دربار قیصری میں تمام اخبار نویس ہر صوبے سے مدعو کئے گئے تھے۔ انکا کیمپ خاص تھا۔ خیمے بہ کمال تزئین وتکلف نصب تھے۔ دو اڈیٹروں کے لئے ایک خیمہ ضروری فرنیچر واسباب آرام کے ساتھ مخصوص تھا کھانے اور ناشتے کے لئے خاص سرکاری اہتمام تھا۔ بے تکلف چائے ہر وقت تیار رہتی تھی۔ چمن بندیاں اعلےٰ پیمانہ پر تاحد نظر ہر طرف تھیں۔ میں بھی منشی نظام اللہ مرحوم مالک ریاض الاخبار بھی۔ دہلی گئے۔ کیمپ کے سوا۔ مولانا ابوالمنصور مرحوم امام فن مناظرہ کے دولت خانے پر بھی مہمان بننا پڑا۔ شب گذاری کا اتفاق وہیں ہوتا۔ کیمپ میں پنجابی اخبار لاہور کا خیمہ ہماری شرکت میں تھا۔ مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے خان بہادر سید ناصر علی صاحب غالباً موجود نہ تھے۔ بعد کو آگئے۔ آپ کے چھوٹے بھائی سید نصرت علی صاحب مالک نصرت الاخبار دہلی کا زیادہ ساتھ رہا۔ مولانائے مرحوم کی طرف سے مہمان نوازی کا بار اُنھیں پر تھا۔

دن تو والیان ملک کے عالیشان پُرفضا فردوسی کیمپوں میں گذرتا جو دہلی کے باہر کوسوں تک پھیلے ہوئے تھے ہر کیمپ میں لہلہاتے ہوئے چمن زار سجے ہوئے بازار ان کی وضع وقطع انکی آراستگی۔ یہ بھولا ہوا خواب کہانتک بیان کرسکتا ہوں۔ تمام اڈیٹران اخبار میری ہی طرح کیمپوں کی گلگشت میں رہ کر بقدر مراتب نفع اندوز ہوتے۔ اسی گلگشت میں ظہیر دانور مرحوم سے بھی شرف نیاز حاصل ہوا۔ میری باریابی نواب مروان علی خانصاحب بہادر خیرپور سندھ کے حضور میں بہ امتیاز خاص ہوئی تھی۔ مگر نے صرف دو سو روپیہ حضور نواب صاحب اور تمام درباری فارسی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ خان قلات کے کیمپ میں بھی دو ایک اخبار نویس پہنچے۔ امیر قلات نے جب دریافت کیا

کون لوگ ہیں تو کہنے والے نے کہا کھیر والا۔ امیر صاحب ان کو گور کن سمجھے۔ متغض پیدا ہوا اور وہ کیمپ باہر کر دیئے گئے۔

مجھے مہاراجہ کشمیر کے کیمپ میں جانے کا اتفاق اس بنا پر ہوا تھا کہ مہاراجہ اس سے پیشتر جب رونق افروز لکھنؤ تھے تو سیٹھ سیتا رام صاحب تعلقدار لسبواں جنکے روابط مہاراجہ سے تھے۔ مجھے بھی اپنے ہمراہ لے گئے تھے مگر اس وقت مہاراجہ بعزم واپسی سوار ہو رہے تھے۔ سرسری شرف تعارف حاصل ہو سکا۔ دربار دہلی کی تقریب میں سیٹھ صاحب موصوف بھی تشریف فرمائے دہلی تھے۔ مجھے بھی مہاراجہ کے کیمپ میں ہمراہ لے گئے۔ درباری کیمپ کے قریب پہونچکر ہمنے دیکھا کہ درباری کیمپ سے شمس العلماء مولانا عبدالحق صاحب علامۂ خیرآبادی کسیقدر متغض آ رہے ہیں۔ کشمیر کے ایک اعلےٰ افسر بھی لجاجت کناں ساتھ ہیں۔ مولانا اسی تنغض کے ساتھ فٹن پر سوار ہو گئے۔ ہم لوگ اڈی کانگ کے خیمے میں چلے آئے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ سیٹھ صاحب نے استفسار فرمایا۔ کیا واقعہ ہے۔ جواب ملا اس وقت مہاراجہ سے ملاقات نہیں ہو سکتی واقعہ یہ پیش آگیا ہے کہ شمس العلما کے تشریف لانے کے واسطے یہ وقت مقرر کیا گیا تھا شمس العلما تشریف لائے۔ مہاراجہ نے براہ تعظیم گوشہ مسند پر جگہ دی۔ مزاج پرسی فرمائی ساتھ ہی حکم دیا کہ ولیعہد کے آتالیق مولانا صاحب کو بھی تکلیف دو وہ بھی تشریف لائے۔ مہاراجہ نے انھیں بھی براہ تعظیم شمس العلماء کے مقابل گوشہ مسند پر جگہ دی۔ ممکن ہے شمس العلما کی نازک مزاجی نے اسے پسند نہ کیا ہو۔ مہاراجہ نے فرمایا مجھے مدت سے آرزو تھی کہ ایسے بلند پایہ علما کا کسی مسئلہ پر مناظرہ دیکھوں۔ یہ سنتے ہی شمس العلماء نے برافروختگی کے ساتھ کہا۔ مہاراجہ آپ نے مرغ اور بٹیر کی پالیاں دیکھی ہوں گی۔ علما کی یہ شان نہیں ہے۔ ساتھ ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مہاراجہ کو عرق آگیا۔ شمس العلما کے روانہ ہوتے ہی مہاراجہ نے افسر اعلےٰ کو بہ ندامت پیچھا کیا فرمایا۔ وہ شمس العلماء کے ہمراہ لجاجت کناں فٹن تک آئے۔ شمس العلماء نے کچھ جواب نہیں دیا سوار ہو گئے۔ ہم لوگ بھی بغیر ملاقات واپس آئے۔ مہاراجہ پر اس ناگوار واقعے کا زیادہ اثر تھا۔ میں شمس العلماء کی خدمت میں ان کی فرودگاہ پر برابر جایا کرتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا۔ دوسرے روز مہاراجہ کشمیر نے افسر اعلےٰ کے ذریعہ سے گیارہ پارچے کا خلعت اور نقد دو ہزار روپے معذرت کے ساتھ شمس العلماء کی خدمت میں بھیجے۔ شمس العلماء نے بجواب کہا آپ میری طرف سے معذرت اور اظہار افسوس اس وقتی اتفاق پر کیجیگا مجھے افسوس ہے کہ مہاراجہ نے براہ قدردانی خلعت و نقد سے عزت افزائی کی مگر میں اس کے قبول کرنے سے معذور ہوں۔ کیونکہ میں رئیس رام پور کا ملازم ہوں۔ رئیس کی اجازت و منظوری کی ضرورت ہے۔ افسر اعلےٰ مع خلعت و زر نقد واپس گئے۔ یہ پرچہ نواب مشتاق علی خاں بہادر ولی عہد رام پور کو اپنے کیمپ میں گذرا۔ خلد آشیاں بیماری کی وجہ سے دہلی آنے اور دربار قیصری میں شرکت سے معذور تھے۔ یہ پرچہ گذرنے پر خلد آشیاں کو اس واقعہ کی اطلاع تار پر دی گئی۔ تار ہی پر جواب آیا۔ ہماری طرف سے گیارہ پارچے کا خلعت اور نقد دو ہزار شمس العلماء کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ ایسا ہی ہوا۔ شمس العلماء جو کسی بات پر مدار المہام رام پور سے برہم ہو کر دہلی اس غرض سے آئے تھے کہ

واپس نہ جائیں اور کسی ریاست میں ملازمت کر لیں۔ اس قدر افزائی پر دربار قیصری کے بعد رام پور چلے آئے۔ اور پھر خلد آشیاں سے کبھی جدا نہ ہوئے۔ اول سر سالار جنگ بہادر بھی نا بالغ فرماں روائے دکن اعلیٰ حضرت میر محبوب علیخاں بہادر کی معیت میں رونق افروز اپنے شاہی کمپ میں تھے۔ وہیں ہم لوگوں کو اڈیٹر صاحب جریدہ روزگار مدراس اور حیدر آبادی عفو صاحب وغیرہ سے ملنے کا بار بار اتفاق ہوا۔ ایک روز ہم لوگوں کو گشت میں شام ہو گئی۔ شہر کو واپس آتے ہوئے پرنس آف ارکاٹ مدراس کے کمپ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ نواب ناظر علی خاں بہادر خیر آبادی خویش پرنس آف ارکاٹ پرنس کے ہمراہ شرکت دربار کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ ممدوح ہمارے اور نظام اللہ مرحوم کے قریبی بزرگ عزیز تھے۔ دن میں سوا ناشتے کے کچھ کھانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا بلکہ جلد واپس ہونے کا قصد تھا۔ نہ بجے شب کو واپسی کی اجازت چاہی مگر فرش پر دسترخوان بچھ چکا تھا۔ پہلے مجھ سے یہ اصرار کیا گیا مگر میں نے معذرت کی جب نظام اللہ مرحوم سے کہا گیا وہ بے تکلف دسترخوان پر نظر آئے۔ میری طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ میں اشارے سے کچھ کام لیتا میرے لئے صبر کے سوا چارہ کیا تھا۔ کھانے کے ساتھ۔ سرخ سبز مختلف رنگ کی مدراسی شیرنی بھی تھی نظام اللہ مرحوم نے اسکے لئے بھی اشارہ کیا۔ قہر گرسنہ بر جان گرسنہ دسترخوان ختم ہوا تو خواب گاہ کے اندر میزوں کی طرف طشتریاں جاتی نظر پڑیں۔ کچھ دیر کے بعد میں نے اجازت چاہی بزرگ ممدوح نے فرمایا۔ شہر بہت دور ہے رات زیادہ گئی ہے واپس نہیں جا سکتے۔ میں کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ نظام اللہ مرحوم نے منظور کر لیا۔ خواب گاہ میں سامان استراحت ہو گیا۔ سب حضرات آرام فرمانے لگے۔ میں گرسنگی کی شدت میں کروٹیں بدل رہا تھا۔ نیند کا کیا ذکر۔ روشنی کم کر دی گئی تھی۔ مجھے کچھ سہارا تھا تو رنگین شیرنی کی طشتری کا۔ جب ہر طرف سے نفیر خواب بلند ہوئی میں اُٹھا اور دبے پاؤں میز کے قریب پہنچکر ہاتھ بڑھایا۔ ڈلی کا محسوس ہونا تھا کہ وہ منھ کے اندر پہنچ گئی۔ میں چاہتا یہ تھا زبان پر پہنچنے سے پہلے حلق میں اتر جائے مگر وہ کمبخت سانپ کے منھ کی چھچھوندر بن گئی نہ اُگلنے کی نہ نگلنے کی۔ رقیق شے ہوتی تو آپ تلخ کا دہو کھاتے۔ یہ رنگین شیرنی کی ڈلی نہ تھی۔ صابن کی بٹی تھی میری مصیبت کا پورا لطف اُٹھانا ہو تو کچھ دیر کے لئے صابن کی ٹکیہ منھ میں رکھکر کام و دہن کو ممنون کیجئے۔ رومال سے صاف ہو کر وہ چیز وہیں گئی۔ جہاں سے اُٹھائی گئی تھی۔ پانی کی تلاش میں کسی کی آنکھ کھل جانے کا اندیشہ تھا رومال کی کار فرمائی منھ کے اندر بھی رہی۔ ہم اس آسانی سے پلنگ تک نہ پہنچ سکے جس طرح وہ چیز منھ تک پہنچی تھی۔ اب صابن اپنی جگہ پر تھا۔ مگر اسکی لذت زبان پر۔ سب حضرات پابند نماز تھے نماز فجر ادا کی۔ ساتھ ہی چائے مع بسکٹ وغیرہ سامنے آ گئی۔ میں نے دو چار گھونٹ پی کر بسکٹ اُٹھا کر اتنے زیادہ پیالی میں ڈالے کہ بزرگ ممدوح کو میری طرف توجہ ہو گئی دوسری پیالی بڑھا کر کہا اب بسکٹ اس میں ڈالے جائیں نظام اللہ مرحوم کو ہنسی آ گئی جو معنی خیز تھی۔ استفسار پر انھوں نے کہا آپ تمام دن بھوکے رہے تھے۔ پھر بھی شب کو کھانے میں تکلف کیا۔ واپسی کا بھی سہارا ٹوٹا۔ چائے میں تکلف رخصت ہو گیا۔ آپ بسکٹ سے زیادہ بے تکلف ہو گئے۔

میں دل میں خوش تھا کہ خدا نے صابن کے واقعہ کا پردہ رکھ لیا۔ نیاز صاحب یہ اُسی کا اثر تھا آپ نے جب کہا آپ کے ساتھ کھانے میں اس طرح شریک ہو گیا جس طرح کسی کافر کے ساتھ پینے میں۔ خدا کرے یہ کہنے کا کہیں جلد موقع ملے ؎

دیر چھلکتا ہوا کیا جام شراب آتا ہے ، اسے میں قربان مرا عہد شباب آتا ہے ،

کیا صابن کا واقعہ۔ صحیح مذاق شعری رکھتے ہوئے آپ کے لئے اچھے شعر سے کم ہے۔

اب میں دربار دہلی کا ذکر چھوڑتا ہوں۔ اس کے لئے بوستان خیال کی ضخامت درکار ہے۔ کمبخت کی یاد یاد جوانی سے کم نہیں۔

یہی کہتے ہوئے وہاں رہے اور یہی کہتے ہوئے واپس ہوئے ؎ ریاض

دربار قیصری کے عجب رنگ ڈھنگ ہیں ، دہلی ہے اور ہم ہیں بتان فرنگ ہیں ،

میں دہلی سے آگرے آیا۔ میرے والد ماجد مولوی سید طفیل محمد کوتوال آگرہ تھے دو چار روز ٹھہر کر براہ مراد آباد رام پور پہنچا۔ استاد مرحوم نے سرکاری مہمان نہ بننے دیا۔ اپنے یہاں ٹھرایا۔ سرکار سے اجازت لیلی تھی دوسرے روز جناب داغ ۔ جناب نیر اور بعض شعرا مجھ سے ملنے آئے۔ میں بھی سب حضرات کی خدمت میں تا قیام حاضر ہوتا رہا وہ سب حضرات بھی تشریف لاتے رہے۔ جان صاحب مشہور ریختی گو دو بار روزانہ آتے تھے :

یہی زمانہ تھا کہ سرکار کا فارسی دیوان۔ لسان الملک وزیر ایران کی اصلاح سے مزین و معزز سفیروں کی معرفت رام پور آیا تھا۔ سفیر سرکاری مہمان تھے۔ ہر طرف اصلاحات دیوان کا چرچا تھا۔ خلد آشیان کا شغف خاطر بڑھا ہوا تھا۔ میں بر رسم دیرینہ نواب آفتاب الدولہ خلق سے جا کر ملا جناب اسیر موجود نہ تھے۔

شعرا علماء فضلاء دیگر ممتاز حضرات روزانہ دربار میں جاتے دربار کا وقت ایک بجے سے ۴ بجے تک تھا درباری ہال سے ملا ہوا ایک کمرہ استاد مرحوم کے لئے عوارض کی وجہ سے مخصوص تھا۔ درباری نشستگاہ سے کچھ دور مصاحب منزل کی عمارت تھی۔ سب حضرات وہاں موجود رہتے۔ سرکار جسے یاد فرماتے چوبدار نام لیکر درباری ہال کے آخری دروازے سے پکارتا۔ حضور یاد فرماتے ہیں۔ یہ سلسلہ تا دیر جاری رہتا۔

خلد آشیاں کا شاہی رعب ہر ہستی پر بہت زیادہ اثر انداز تھا البتہ شمس العلماء مولانا عبدالحق علامہ خیر آبادی اس سے مستثنےٰ تھے۔ میں بھی مصاحب منزل میں وقت سے کچھ پہلے حاضر ہوا۔ جناب داغ جناب منیر علامہ خیر آبادی نیر دو چار صاحب اور تشریف فرما تھے۔ آنے کا سلسلہ جاری تھا۔ مصافحہ و معانقہ و مزاج پرسی کے بعد۔ جناب داغ نے باصرار کچھ سنانے کے لئے مجھ سے ایما فرمایا۔ بہ تعمیل ارشاد میں نے یہ مطلع پڑھا ؎

ہنگام نزع گریہ یہاں بیکسی کا تھا ، تم ہنس پڑے یہ کونسا موقع ہنسی کا تھا

تحسین و آفرین کی آواز ہر طرف سے ہمت افزائی کے لئے آئی۔ اسی طرح ہر شعر کی داد مجھے ملی۔ میں نہیں کہہ سکتا

تقاضائے اخلاق و مہمان نوازی تھا۔ یا واقعی اشعار اس کے مستحق تھے۔ اس زمن میں ایک شعر ایسا تھا جو بعض حضرات کو یاد رہ گیا۔ میں وہ شعر بھی آپ کے ملاحظے کو یہاں درج کئے دیتا ہوں ؎

یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش سُن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

اب یاد فرمائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آواز آئی۔ مولانا عبدالحق صاحب کو حضور یاد فرماتے ہیں۔ اسی طرح منیر و داغ اور دیگر حضرات تشریف لے گئے۔ بیس بتیس کے بعد میرا نمبر آیا۔ خسخانے میں بیرونی روشنی سے آتے گونہ تکلف ہوتا تھا۔ میں اس دروازہ پر پہنچا تو نگہ روبرو کی صدا بلند ہوتی تھی۔ آواز کے ساتھ ہی مجھے سلام کے لئے جھکنا پڑا۔ درباری سب آداب استاد مرحوم سے دریافت کر کے نقش دل کر چکا تھا۔ سرکار کی نشست تقریباً وسط ہال میں مسہری پر تکیوں کے سہارے تھے۔ ایک صف مسہری کے روبرو جنوب میں استاد مرحوم سے شروع ہو کر کسی اور پر ختم ہوئی ہے دونوں صفوں کے مابین۔ کچھ جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔ جب سے نگہ روبرو کی منزل طے کر کے مجھے نذر دینے مسہری کی طرف بکمال ادب دست بستہ نیچی نظریں۔ خسخانہ کی خوش گوار کم روشنی میں سنگ مرمر کی خنک فرش پر سے گزرنا پڑا۔ نذر پیش کی قبول ہوئی۔ واپسی میں بھی رخ خلد آشیاں کی طرف تھا۔ خدائے بخیر و خوبی منیر کے برابر نشست کی۔ شکل آسمان کی زانو شکستہ دست بستہ نیچی نگہ کئے بیٹھ گیا۔ سرکار نے فرمایا ریاض تم نے آنے میں بہت دیر کی۔ معذرت کے الفاظ ختم ہونے پر داغ سے فرمایا۔ ہمارا کچھ کلام ریاض کو سناؤ۔ جناب داغ نے اپنے قامت سے زیادہ کشیدہ و بلند آواز سے اپنے مخصوص انداز میں سرکار کے اشعار سنائے۔ کبھی حضور خود۔ قافیہ و ردیف اور کسی غزل کا مصرع داغ صاحب کو بتا دیتے۔ جس طرز خاص سے اشعار کی داد دیجاتی تھی۔ اس نے حضور کو اس قدر لطف اندوز کیا کہ خود حضور اپنے شعر سنانے لگے۔

دیر تک یہ رنگ قائم رہنے کے بعد ارشاد فرمایا۔ ریاض تم کو فارسی کا بھی شوق ہے۔

سنتے ہی روح مائل پرواز نظر آئی اس لئے کہ اصلاحی دیوان فارسی دیکھنے کا استاد مرحوم نے کچھ موقع اپنے دولت خانے پر دیدیا تھا۔ جس میں بہ کثرت عربی فارسی کے لغت۔ بندشیں خاص۔ بلند مطالب کے سوا زبان بدلی ہوئی۔

مجھے جواباً عرض کرنا پڑا۔ حضور کے فارسی کلام کا بہت مشتاق ہوں۔ حضور نے استاد مرحوم سے ہم اٹھا قافیہ مخصوص قصیدہ سنانے کی فرمائش کی۔ چوبدار دیوان لایا۔ استاد مرحوم نے اپنے خاص انداز میں بلند آواز سے مطلع پڑھا۔ مجھے اتنا موقع مل گیا تھا کہ منیر مرحوم سے اشارہ کر سکوں۔ روشن ضمیر منیر یقیناً میرا مفہوم سمجھ گئے آپ نے اس وضاحت سے لفظ لفظ کی تعریف کی کہ مجھے منیر کے ساتھ ہموار رہنے میں زیادہ دقت نہیں پیش آئی قصیدہ ختم ہونے پر زیادہ وقت گزر جانے سے ریکے بعد دیگرے حضرات رخصت ہونے لگے۔ میں بھی اسی سلسلہ میں اپنی قیام گاہ تک پہنچ گیا۔ درباری نشست جس کا اتفاق پھر بھی ہونے والا تھا۔ ایسی نہ تھی کہ میں اسے کبھی بھول سکوں۔

میں جاتے ہی بیمار ہو گیا اور مصنوعی صحت بھی قائم نہ رکھ سکا۔

دوسرے روز استاد مرحوم نے دربار سے واپس آنے پر سرکار کی ایک غزل تضمین عطا فرمائی اور بلا بیائے سرکار ابھی طرح میں غزل کہنے کے لئے بھی ارشاد فرمایا۔ بیماری نے حاضری دربار سے مطمئن کر کے مجھے فکر کا اچھا موقع دیدیا۔ غزل بھی کہی مصرعے بھی لگائے۔ آپ اگر چاہیں گے تو ناظرین نگار کے روبرو مجھے پیش کرنے میں عذر نہ ہوگا۔

میں تو عذر بیماری سے سرکار میں جا نہ سکا۔ استاد مرحوم نے تضمین بھی پیش کی اور غزل بھی۔ وقت حضوری سرکار نے مجھ سے ارشاد کیا اگر مشق سخن رہی تو مجھ سے گوئے سبقت لے جاؤ گے۔

اشعار مندرجہ ذیل حاضرین کو بھی سنائے گئے۔ میر و داغ نے بھی مجھ سے تعریف کی یہ دونوں شعر لوگوں کو یاد بھی ہو گئے خصوصاً دوسرا شعر وہ شعر یہ ہیں ؎

جس کا تمام خلق نے رکھا ہے خضر نام
کھٹکا ہوا یہ کوئی مرا نامہ بر نہ ہو

باہم شب وصال اُٹھائے ہیں کیا مزے
وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں الٰہی سحر نہ ہو

خلد آشیاں نے چاہا۔ میں رامپور سے واپس نہ جاؤں۔ ماہوار بھی تجویز فرما دی۔ استاد مرحوم نے مجھ سے مشورہ فرما کر اخبار و پریس کی وجہ سے فوراً تعمیل ارشاد میں میری طرف سے اظہار معذرت اور چند روز کے بعد وعدہ حاضری کا اظہار فرمایا جس روز میں رخصتی سلام کو جانیوالا تھا۔ اس سے ایک دن پیشتر استاد مرحوم نے افسردگی کے ساتھ مجھ سے فرمایا کہ شمس العلما اور داغ صاحب نے ذکر آنے پر سرکار سے عرض کیا کہ دیوان ناظم کی مطبوعہ جلدیں بہ احتیاط کتب خانے میں مدت دراز سے رکھی ہوئی ہیں اگر ریاض کو مرحمت فرمائی جاویں تو پریس و اخبار کی وجہ سے وہ بہت کافی طور پر نفع اندوز ہو سکیں گے۔ سرکار نے بھی یہ تجویز پسند فرمائی۔ میں نے استاد مرحوم سے عرض کیا خیرآباد ایسا مقام ہے جہاں کاغذ بھی آسانی سے فراہم نہیں ہو سکتا۔ استاد مرحوم نے فرمایا آپ ہی سرکار میں وقت رخصت عرض کریں۔ میں خود کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔

میں نہایت افسردگی کے ساتھ دوسرے دن۔ سلام رخصت کی غرض سے حاضر دربار ہوا سرکار نے بہ لطف خاص ارشاد فرمایا کہ ریاست کو ہمیشہ اپنا گھر سمجھو اور حسب وعدہ تا امکان بے نظیر کے میلے سے کچھ قبل آ جاؤ۔ میں نے عزت افزائی پر دلی شکریہ ادا کیا۔ کچھ غدر کا ذکر اور ریاست کی خدمات بیان فرمائے۔ ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا کہ ریاض الاخبار میں اسکا ذکر نہ آنے پائے۔ آخر میں حسب ایما چوبدار۔ ایک کشتی حضور کے روبرو لایا۔ مجھے بھی قریب جانا پڑا حضور نے خلعتی دوشالہ اپنے دست مبارک سے میرے زیب دوش کیا۔ مقررہ آداب دربار کے موافق با ادب سلام کر کے جب مکان کو روانہ ہوا تو بے ساختہ یہ شعر موزوں ہو گیا ؎

ریاض اس درجہ وہ نواب کی بخشش پہ عاشق تھی　　لپٹ کر رہ گئی تقدیر خلعت کے دوشالے میں

استاد مرحوم دربار میں آج تشریف نہیں لے گئے تھے۔ منتظر تھے کہ کاغذ خیرآباد میں نہ فروخت ہونے کی معذرت کا کیا نتیجہ ہوا۔ استاد مرحوم سے زیادہ جناب مفتی طالب حسین صاحب برادر معظم امیر مینائی مرحوم جو غالباً اس وقت مفتی عدالت تھے اور جامع کمالات بھی میرے نتیجۂ رخصت کے منتظر تھے۔ میری واپسی پر خلعت و دوشالہ عطا ہونے سے بہت خوش ہوئے۔ یہ ذکر ہو ہی رہا تھا کہ گیارہ چوبدار و رومی پوش مع جمعدار کے کشتیاں سربند لئے ہوئے آئے۔ جمعدار نے استاد مرحوم سے عرض کیا۔ سرکار نے ریاض صاحب کے لئے یہ کشتیاں بھیجی ہیں۔ ہر کشتی میں دس یا پندرہ جلدیں دیوان ناظم کی تھیں۔ اور ایک کشتی میں کچھ پارچہ اور دو سو روپیہ۔ نقد کے ساتھ کسی چیز کے لینے میں مجھے کیا عذر ہو سکتا تھا۔ استاد مرحوم مع موجودین بہت خوش ہوئے۔ چوبداروں کو استاد مرحوم نے زر انعام دیکر رخصت کیا اور مجھے زردار بنا کر۔

(حقوق نقل محفوظ)　　عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ　　(باقی آئندہ)

ریاض خیرآباد اودھ ۱۶ جنوری ۱۹۳۱ء

فہرست کتب موجودہ دفتر رسالہ اردوئے معلیٰ کانپور

جلد رسالہ اردوئے معلیٰ بابت ۱۹۲۵ء و ۱۹۲۶ء مکمل مجلد للعہ

جلد رسالہ اردوئے معلیٰ بابت ۱۹۲۷ء و ۱۹۲۸ء و ۱۹۲۹ء للعہ

جلد رسالہ اردوئے معلیٰ بابت ۱۹۳۰ء مکمل و مجلد للعہ

دیوان غالب معہ شرح۔ از حسرت موہانی مع مقدمہ مفید حالات غالب و تنقید کلام غالب عہ

کلیات حسرت موہانی یعنی مجموعہ دواوین حسرت از حصہ اول تا حصہ ہشتم مع ضمیمہ مکمل سے

انتخاب کلیات حسرت موہانی۔ مع ترجمہ انگریزی نو نسخے چھاپا یا قطع چہ پاکٹ بک بلد معہ عہ

انتخاب سخن از حسرت موہانی گیارہ جلدوں میں

یعنی اردو زبان کے جملہ مستند اور رفقا و دیوان شعرائے نایاب کلام کا انتخاب بہ تفصیل ذیل

انتخاب سخن۔ جلد اول۔ (سلسلہ شاہ حاتم) یعنی انتخاب دو دواوین۔ ابتدا۔ یکرنگ۔ شاہ مبارک آبرو۔ تاباں۔ ناجی۔ امیر۔ آفسر۔ بتیاب۔ حسرت۔ طالب۔ معروف و شاہ نصیر۔ ۱۰ر

انتخاب سخن۔ جلد دوم۔ (سلسلہ ذوق) دیوان ذوق جلد دو دواوین۔ داغ۔ رسا۔ جگر ۱۰ر

انتخاب سخن۔ جلد سوم۔ (سلسلہ مومن) دیوان مومن۔ نسیم۔ تسلیم۔ حسرت موہانی۔ قیمت عہ

انتخاب سخن۔ جلد چہارم۔ (سلسلہ منیر) دیوان حسرت۔ یقین۔ حزیں۔ شاہ و بیان۔ شاہ ارکان۔ قیمت عہ

انتخاب سخن۔ جلد پنجم (سلسلہ جرات) دیوان حسرت استاد جرات۔ دیوان جرات۔ عظیم۔ رضا۔ رقت۔ رضوی۔ محنت۔ نصرت۔ معروف۔ محبت۔ جلال۔ شائق۔ نساخ و وحشت۔ قیمت (۱۰ر)

انتخاب سخن۔ جلد ششم (سلسلہ مصحفی) دیوان مصحفی۔ مشفق۔ منتظر۔ قیمت (۱۳ر)

انتخاب سخن۔ جلد ہفتم (سلسلہ آتش) دیوان آتش۔ صبا۔ خلیل و قمر و فروغ۔ ۶ر

انتخاب سخن۔ جلد ہشتم۔ (سلسلہ میر امیر) دیوان اسیر۔ امیر و جلیل۔

انتخاب سخن۔ جلد نہم۔ (سلسلہ ناسخ) دیوان ناسخ۔ برق۔ جلال۔ آرزو۔ قیمت ۱۳ر

انتخاب سخن۔ جلد دہم (سلسلہ غالب) مجروح۔ سالک۔ حالی۔ سندی۔ شعلہ۔ تسکین۔ اسمٰعیل عہ

انتخاب سخن۔ جلد یازدہم (اساتذہ متفرق) دیوان فغاں۔ آرزو۔ رونق۔ صمیم۔ ندرت۔ فانی۔ عزیز و محشر۔ قیمت ۱۰ر

دیوان شاہ حاتم ۶ر　　دیوان علی میاں کامل لکھنوی ۸ر

دیوان منشی راسخ عظیم آبادی ۱۰ر　　دیوان نوبت رائے نظر لکھنوی ۲ر

دیوان سودا و میر و شاد ۴ر　　دیوان نازش بدایونی ۲ر

دیوان میر سوز ۴ر　　رسالہ محاسن سخن از حسرت موہانی ۶ر

رسالہ متروکات سخن از حسرت موہانی ۶ر　　رسالہ شیخ سخن یہ رسالہ نکات سخن یعنی فہرست سلاسل شعرائے اردو ۴ر

ملنے کا پتہ: حسرت موہانی دفتر رسالہ اردوئے معلیٰ کانپور

جسم کیلئے خانوں کی اہمیت

جاندار اشیاء کی ساخت

تمام حیوانات اور نباتات کا جسم چھوٹے چھوٹے خانوں سے بنا ہوا ہے۔ پودوں میں یہ چھوٹے خانے ایک دوسرے سے ایک باریک جھلی سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ لیکن حیوانوں میں ان خانوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کے لئے کوئی جھلی نہیں ہوتی۔ پودوں میں خانہ کی جھلی تمام جسم کو مضبوط اور قوی رکھتی ہے۔ لیکن یہ جھلی خانوں کے باہمی ربط میں کوئی مزاحمت نہیں کرتی۔ کیونکہ جھلی کے بیچ میں سے مادہ حیات کے نہایت مہین مہین تار ایک خانہ سے دوسرے خانہ میں گذرتے ہیں اور ایک نظام سے تمام خانوں کو آپس میں ملاتے ہیں اور اس طرح تمام خانے ہم آہنگی کے ساتھ اپنا فعل ادا کرتے ہیں۔

بعض پودوں میں خانے گُردی ہوتے ہیں۔ لیکن عام طور پر مخروطی منشوری یا کثیر السطح ہوتے ہیں۔ لانبے خانے ریشوں اور نلکیوں[1] کی شکل میں بھی عام طور پر پائے جاتے ہیں۔ خانے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ بلا ایک طاقتور خوردبین کے نظر نہیں آسکتے۔ ایک خانہ کا اوسط قطر $\frac{1}{100}$ ملی میٹر تک ہوتا ہے۔ بعض خانے جو دوخدمت کے لئے کسی خاص طور پر مفید ہوتے ہیں ۲۰ سینٹی میٹر تک قطر رکھتے ہیں۔ اور ایسے خانے جو درختوں میں عرقی نالیوں[2] کا کام دیتے ہیں کئی کئی گز لمبے ہوتے ہیں۔

خانوں کی دریافت کا حال

۱۶۶۵ء میں رابرٹ ہک نامی ایک انگریز محقق نے کاگ کے ایک ٹکڑے کو باریک کاٹ کر خوردبین کے نیچے دیکھا اور معلوم کیا کہ وہ بیشمار چھوٹے چھوٹے خانوں کا بنا ہوا ہے۔ اس نے جو کچھ خوردبین میں دیکھا اس کا نقشہ کاغذ پر اتارا جو اس طرح کا تھا۔

[1] پودے یا درخت کی ان نلکیوں سے مراد ہے جو جڑ سے تنے تک یا ایک حصہ سے دوسرے حصے تک پانی یا کوئی محلول پہنچاتے ہیں۔

[2] دیکھو نوٹ نمبر [1]

اس کے بعد اس قسم کے نقشے ہم کو ایک اطالوی محقق میلفیجائی کے بنائے ہوئے ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سترہویں صدی عیسوی میں اس نظریہ کی بنیاد پڑ چکی تھی کہ تمام جاندار اشیا کا جسم چھوٹے چھوٹے خانوں سے بنا ہوا ہے۔

خانہ کے کیمیاوی اجزاء اور انکا فعل

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ خانے درخت کیلئے کس طرح پر مفید ہیں اور کیا کام انجام دیتے ہیں اسکے لئے پہلے ہم کو یہ دیکھنا چاہئیے کہ ایک خانہ کی ترکیب کیا ہے۔ ایک اُبھرتے ہوئے پودے کی نوک سے ایک باریک ٹکڑا کاٹ کر اگر خوردبین کے نیچے دیکھا جائے تو چھوٹے چھوٹے خانے ایک نیم سیال گوند کی قسم کے مادہ سے بھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس مادہ کو تخم مایہ کہتے ہیں اور اس پر پودے کی نشو و نما بلکہ اس کی حیات کا پورا مدار ہے۔ ہر ایک خانہ کی شکل تقریباً ایسی ہوتی ہے۔

ہر ایک خانہ کے اندر ایک کروی یا بعض اوقات بیضاوی شے ہوتی ہے۔ یہ خانے کے بہت بڑے حصے کو گھیرے رہتی ہے اس کو خانے کا مرکزہ کہتے ہیں ایک صاف دانے دار مادہ جو کہ خانہ کی جھلی اور مرکزہ کے جھلی کے درمیان بھرا ہوا ہوتا ہے مادالحیات کہلاتا ہے۔ مادالحیات میں متعدد چھوٹے اور روشن جیسے ہوتے ہیں جنھیں رنگ دانے کہتے ہیں یہ مرکزہ۔ مادالحیات اور رنگ دانے خانے کے حیاتی اجزا ہیں اور سب مل کر پودے کا تخم مایہ کہلاتے ہیں۔ اگرچہ ابھی تک پودے کا صحیح فعل دریافت نہیں ہو سکا ہے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ مرکزہ اور مادالحیات کے باہمی عمل سے خانہ کی زندگی اور خانوں کی زندگی سے تمام پودے کی زندگی قائم ہے۔ اس بات کا بیان کرنا ضروری ہے۔ کہ صرف پودے کے منقسم حصے کے خانے تخم مایہ سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ پودے کے اس حصہ کو منقسم حصہ کہتے ہیں کیونکہ پودے کے نشو و نما کا طریقہ یہ ہے کہ ایک خانہ سے تقسیم ہو کر دو اور دو سے چار اور چار سے آٹھ خانے بنتے ہیں۔ خانہ کی تقسیم کا صحیح طریقہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ ہم آگے بیان کریں گے۔ جیسے جیسے ہم پودے کے نیچے حصہ کے خانوں کو دیکھتے ہیں جس میں نشو و نما کا عمل بند ہو گیا ہے اور خانے کسی خاص فعل کے لئے مخصوص ہو گئے ہیں۔ ہم کو مادالحیات میں خلئے ملتے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ مادالحیات خانہ کے حجم کی تناسب سے نہیں بڑھتا۔ اس صورت میں

مادۃ الحیات کی ایک پتلی تہ خانہ کی جھلی کے اندر چاروں طرف لگی رہتی ہے اور مرکزہ بھی اسی مادۃ الحیات کی تہ میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ بعض حالتوں میں خلیے کے اندر مادۃ الحیات کی پٹیاں ایک کونے سے دوسرے کونے تک تنی ہوئی ہوتی ہیں ان صورتوں میں مرکزہ اکثر خلیے کے درمیان ان پٹیوں کے ذریعہ سے لٹکا رہتا ہے۔ مرکزہ خواہ کسی مقام پر ہو وہ ہمیشہ مادۃ الحیات میں ڈوبا رہتا ہے۔ اس کا کوئی تعلق خلیے سے نہیں ہوتا۔ ذیل کے نقشوں سے اس بیان کے سمجھنے میں سہولت ہوگی۔

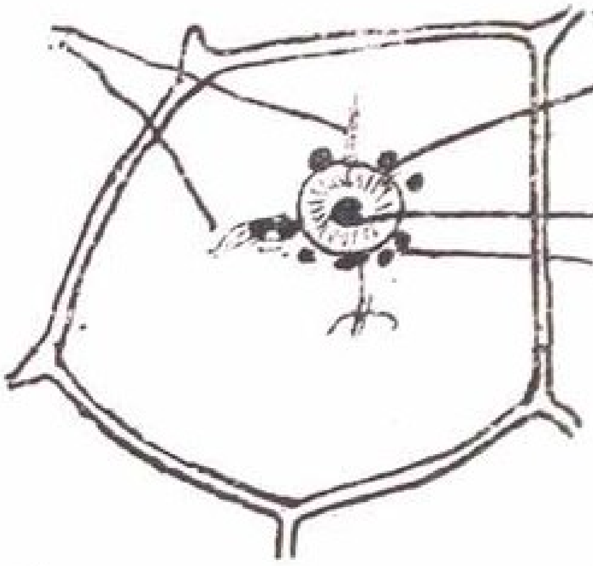

تخزمایہ حیات کی بنیاد ہے

تخزمایہ کے خواص دریافت کرنیکے لئے ہمکو اپنی توجہ نبات متحرک کی طرف لیجانی چاہیئے۔ نبات متحرک ایک قسم کی کائی ہوتی ہے جو تالابوں میں پانی کی سطح پر اکثر تیرتی ہوئی ملتی ہے۔ چونکہ اس کے خانوں میں خوردبین کے نیچے قسم قسم کی حرکتیں نظر آتی ہیں۔ اس لئے اسکو حیوانات اور نباتات کے درمیان رکھا ہے۔ نبات متحرک کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ایک وقت میں بہت سے بے جھلی کے خانوں کا ایک تودہ ہوتے ہیں۔ مادۃ الحیات ایک لوچ دار سیال کی مانند ہوتا ہے جسکے اندر بہت سے چھوٹے چھوٹے ذرات ہوتے ہیں خانہ کی سطح پر سیال ذرا گاڑھا ہوتا ہے اور نسبتاً ذرات کم تعداد میں ہوتے ہیں لیکن درمیان میں سیال ذرا پتلا ہوتا ہے اور ذرات تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں۔ ان ذرات سے محقق کے نقطہ نظر سے ایک فائدہ یہ ہے کہ مادۃ الحیات میں جتنی حرکتیں ہوتی ہیں وہ صاف صاف نظر آسکتی ہیں اب ہم بے جھلی کے خانوں کے اس تودے کو خوردبین کے نیچے رکھکر دیکھتے ہیں۔ ہم کو مادۃ الحیات کی ایک مستقل رُخ خاص سمت میں بہتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ رو ہر وقت اپنی سمت بدلتی رہتی ہے جس سمت میں مادۃ الحیات اندر حرکت کرتا ہے اسی سمت میں اس تودہ کا حصہ باہر کی جانب اُبھر جاتا ہے یعنی مادۃ الحیات کی اندرونی حرکت[1] تودے کی بیرونی

[1] حرکتیں کئی وجوہ سے ہوتی ہیں۔ ایک حرکت جو اندرونی حرکت سے متاثر ہو کر ظاہر ہوتی ہے جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔ اور دوسری حرکت کسی بیرونی شے سے حس کرکے پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر امیبا ایک یک خانوی خوردبینی جانور ہے۔ اس کے سامنے اگر کوئی چیز رکھدی جائے تو فوراً اسکی حرکت کی سمت بدل جاتی ہے۔ یہ بحث علم افعال الاعضاء سے متعلق ہے۔

بیرونی نقل وحرکت کا باعث ہوتی ہے۔ اس نقل وحرکت میں جب نبات متحرک کسی اور چھوٹی شے سے مس کرتی ہے تو اس کو اپنے اندر ہضم کرلیتی ہے جو اسکی خوراک ہوجاتی ہے۔ اسی نقل وحرکت کا نام اصل میں حیات ہے اور اسی سے وہ تمام فعل ظہور میں آتے ہیں۔ جو حیات کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً خوراک حاصل کرنا۔ ہضم کرنا۔ فضلے کو خارج کرنا وغیرہ۔ اسلئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ نخز مایہ ہی اصل میں زندگی کا منبع ہے۔

اب ہم نخز مایہ کی حرکت کا۔ خانہ کے اجزاء کا اور اُنکے خواص کا ذرا مزید تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں۔ نخز مایہ کے اندر عموماً دو قسم کا دوران پایا جاتا ہے ایک وہ دوران کہ نخز مایہ ایک ہی وقت میں مختلف سمتوں میں گھومتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسکی رو ہر لحظہ سمت بدلتی رہتی ہے اور کسی خاص راستہ کی بھی پابند نہیں ہوتی۔ دوسرا دوران وہ کہ بغیر اپنی سمت کو بدلے ہوئے رو برابر ایک ہی راستہ پر چلتی رہتی ہے۔ پہلے قسم کے دوران کو ہم گردش غیر وضعی اور دوسرے کو گردش وضعی کہیں گے۔

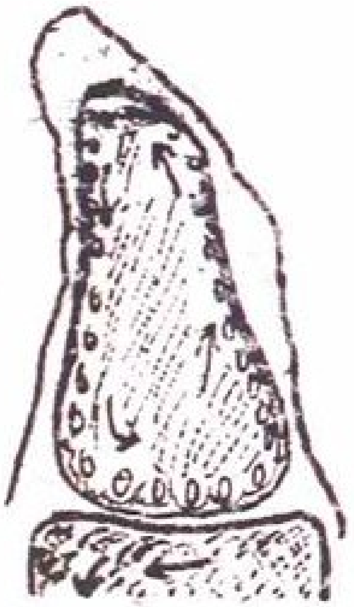
گردش وضعی

گردش غیر وضعی

گردش وضعی عموماً ان خانوں میں ہوتی ہے جن کا مادۃ الحیات سمٹ کر خانہ کی جھلی کے ساتھ لگ جاتا ہے مادۃ الحیات کی رو بھی اس صورت میں جھلی کے برابر بہتی ہے۔ برخلاف اسکے گردش غیر وضعی مادۃ الحیات کے اس حصہ میں بھی ہوتی ہے جو جھلی کے ساتھ ساتھ لگا ہوا ہوتا ہے اور ان پٹیوں میں بھی جو خلے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک تنی رہتی ہیں۔ بعض دفعہ یہ رو اپنے ساتھ مرکزہ اور رنگ والوں کو بھی بہائے پھرتی ہے۔

نخز مایہ کے کیمیاوی خواص

زندہ نخز مایہ کیمیاوی آزمائش پر القلی عمل دیتا ہے اور بعض حالات کے اندر غیر جانب دار لیکن تیزابی عمل کبھی نہیں دیتا۔ یہ بہت سے کیمیاوی

ا ـ القلی۔ غیر جانب دار اور تیزابی عمل۔ یہ کیمیاوی اصطلاحات ہیں۔ القلی کی مثالیں سوڈا (Sodium carbonate) چونہ (Lime) امونیہ (Ammonia) وغیرہ ہیں۔ تیزابی عمل کی مثالیں۔ گندھک کا تیزاب

(بقیہ صفحہ ۵۵ پر)

مرکبوں کا مجموعہ ہے۔ بعض مرکبات اکثر ردوبدل ہوتے رہتے ہیں۔ جسکی وجہ سے نخزمایہ میں زندگی کے گوناگون مظاہر رونما ہوتے ہیں۔ ان مرکبات میں زیادہ اہم پروٹیڈ ہیں۔ دوسرے مرکبات ازنائم۔ کاربوہائیڈریٹ اور چربی کی قسم سے ہوتے ہیں۔ چربی بہت پتلے محلول کی صورت میں موجود ہوتی ہے۔ پوٹاش کے محلول میں نخزمایہ کے تمام اجزا حل ہوجاتے ہیں۔ آئیڈین کے عمل سے اس کا رنگ زردی مائل بھورا اور پارے کے نائٹریٹ سے گلابی سرخ ہوجاتا ہے۔ ان عملوں سے نخزمایہ فوت ہوجاتا ہے۔

خوردبین نے اور بعض کیمیاوی محلول نے خانوں کے چھوٹے سے چھوٹے اجزا کی تحقیق کو بہت آسان کردیا ہے۔ پودے کے جس حصہ کے خانہ کو ہم دیکھنا چاہیں کہ اس کے اندر کیا عمل ہو رہا ہے اور کیا کیا تغیرات ہو رہے ہیں۔ اس کا طریقہ جو تمام تجربے خانوں میں استعمال کیا جاتا ہے یہ ہے کہ اس پر ایک خاص اثر رکھنے والا کیمیاوی محلول ڈالدیں اور پھر اس پر دو ایک اور متعلقہ کیمیاوی عمل کرنے سے اس حصہ کے تمام خانے جس صورت میں ہوں گے۔ اسی صورت میں مردہ ہوجائیں گے۔ اور پھر کسی مزید تبدیلی کے قابل نہیں رہیں گے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ ایک حصہ کے متعدد خانے ایک وقت میں نشوونما کے مختلف مدارج پر ہوں گے۔ کوئی خانہ نشوونما کی کسی منزل پر ہوگا اور کوئی کسی پر۔ ان مختلف مدارج اور منازل کو خوردبین کے نیچے رکھ کر نشوونما کی پوری مسلسل کہانی بنائی جاسکتی ہے۔

پیشتر اس کے کہ پودوں کی نشوونما یعنی خانہ کی تقسیم کا طریقہ دریافت کریں یہ بہتر ہے کہ خانے سے ان اجزا کا جو اس تقسیم میں حصہ لیتے ہیں۔ ذرا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرلیں۔ یہ مطالعہ معمولوں میں اسطرح ممکن ہے۔

(بقیہ صفحہ ۵۰ ملاحظہ ہو)

(Sulphuric Acid) شورہ کا تیزاب (Hydrochloric Acid) طعامی نمک کا تیزاب (Nitric Acid) فاسفورس کا تیزاب (Phosphoric Acid) وغیرہ ہیں۔ ایک القلی اور تیزاب باہم ایک مقررہ مقدار میں ملانے سے کسی قسم کا نمک بنجاتا ہے۔ جو غیر جانب دار ہوتا ہے یعنی نہ القلی کا عمل دیتا ہے نہ تیزابی کا۔ اسکی عام مثال معمولی نمک ہے جس کا کیمیاوی نام (Sodium chloride) ہے۔ ان کیمیاوی صفات کی شناخت کے کئی ذریعے ہیں منجملہ انکے ایک طریقہ جو عموماً معملوں میں استعمال کیا جاتا ہے یہ ہے کہ لٹمس محلول (Litmus Solution) جو معمولی طور پر ارغوانی رنگ کا ہوتا ہے القلی کے عمل سے نیلا ہوجاتا ہے اور تیزابی عمل سے سرخ ہوجاتا ہے غیر جانبدار اشیا کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یعنی لٹمس محلول اگر تیزابی عمل سے سرخ کردیا جائے تو غیر جانبدار شے کس مقدار میں اس میں ڈالی جائے وہ سرخ ہی رہیگا۔ اسی طرح اگر وہ القلی عمل سے نیلا کردیا گیا ہے تو اس صورت میں نیلا ہی رہے گا۔ لیکن اگر سرخ لٹمس میں القلی صرف اس قدر ڈالا جائے کہ تیزاب کے ساتھ ملکر نمک میں تبدیل ہوجائے تو لٹمس اپنا ارغوانی رنگ اختیار کرلے گا۔ مزید القلی ڈالنے پر وہ نیلا ہوجائیگا۔

کہ کیمیاوی محلول خانے کے مختلف اجزاء کو مختلف رنگ دیتے ہیں۔ مثلاً ایک کیمیاوی محلول سے خانہ کا کوئی جزو زرد، کوئی سرخ، کوئی نیلا، کوئی سبز ہو جاتا ہے اور اس طرح تمام اجزاء کی علیحدہ علیحدہ شناخت ہو سکتی ہے۔ خانہ کا جزو اعظم مرکزہ ہے۔ مرکزے عموماً کروی، بیضاوی یا عدسی ہوتے ہیں۔ لمبے خانوں میں مرکزے لمبے بھی ہوتے ہیں۔ مرکزہ خانہ کا تقریباً دو تہائی حصہ گھیرے رکھتا ہے مختق اور مستقل حصہ کے خانوں میں مرکزے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ چوب ساقی پودوں میں ایک خانہ میں عموماً ایک ہی مرکزہ ہوتا ہے لیکن اکثر سماروغی اور بعض صوف البحری[ﻂ۱] پودوں میں ایک ایک خانہ میں کئی کئی مرکزے بھی ہوتے ہیں۔ مرکزہ کے اندر ایک یا ایک سے زیادہ گول اور بہت روشن ذرے ہوتے ہیں جنکا فعل ابھی تک پوری تحقیق کے ساتھ دریافت نہیں ہوا۔ انکو مرکزہ کو چک کہتے ہیں۔ مرکزہ ایک جھلی سے ملفوف ہوتا ہے۔ یہ جھلی مرکزہ کے ارد گرد کے مادالحیات کو مرکزہ کے اندرونی سیال (مرکزی سیال) سے علیحدہ رکھتی ہے۔ مرکزہ کے اندر پروٹیڈ کا ایک جال ہوتا ہے جسکی جالیوں میں کوچک مرکزے پھنسے ہوتے ہیں۔

خانہ کا دوسرا جزو رنگ دانے ہیں۔ منقسم[ﻂ۲] حصہ میں رنگ دانے مرکزے کے ارد گرد رہتے ہیں۔ یہ گول یا تکلے کی شکل کے ہوتے ہیں۔ پودے کے مختق حصے میں یہ تین مختلف قسموں کے ہوتے ہیں۔

(۱) خضر دانے (۲) رنگین دانے (۳) بے رنگ دانے

(۱) پودے کے ان حصوں میں جو روشنی کے سامنے رہتے ہیں رنگ دانے خضر دانوں کی شکل میں مبدل ہو جاتے ہیں۔ یہ سبز رنگ کے چپٹے دانے ہوتے ہیں اور خانے کے سطحی حصے پر لگے رہتے ہیں۔

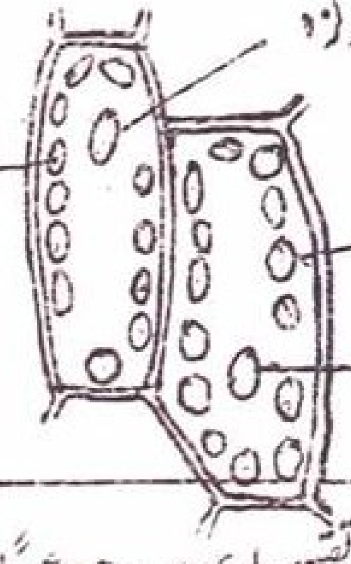

ﻂ۱ منقسم حصہ پودے کے اس حصہ کو کہتے ہیں جس میں خانہ کی تقسیم جاری ہو۔ یہ حصہ عموماً پودے کی نوک پر ہوتا ہے۔ برخلاف اسکے مختق حصہ وہ حصہ ہے کہ جس میں خانے تقسیم نہیں ہوتے بلکہ کسی خاص فعل کے لئے مخصوص ہو جاتے ہیں۔

ﻂ۲ چوب ساقی پودے (Cormopaytes) ان پودوں کو کہتے ہیں جن میں پتے تنے اور جڑ موجود ہوں۔ سماروغی پودوں (Fungi) کی عام مثال پھپھوندی ہے جو نم چیزوں پر اگ آتی ہے صوف البحری پودوں (Algae) کی عام مثال کائی ہے۔

خضر دانے پودے کے لئے ہوا سے خوراک حاصل کرنے کو نہایت ضروری ہیں جس عمل کے ذریعہ سے یہ پودے کو خوراک بہم پہنچاتے ہیں اسکو استحالہ کاربن یا شعاعی ترکیب[۵۷] کہتے ہیں۔ یہاں یہ موقع نہیں ہے کہ استحالہ کاربن کی پوری تفصیل کی جائے تاہم اتنا بیان کرنا ضروری ہے کہ خضر دانوں کے ذریعہ سے پودے کاربن ڈائی آکسائڈ کو جو ہوا کے اندر ملا ہوا ہوتا ہے اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ کاربن ڈائی آکسائڈ پودوں کی خوراک کا ایک بڑا حصہ ہے۔ جن پودوں میں خضر دانے نہیں ہوتے وہ کاربن ڈائی آکسائڈ کو اپنی خوراک کے لئے استعمال نہیں کر سکتے۔ خضر دانے کے اندر چار رنگ ہوتے ہیں اول نلاگی مائل سبز کلوروفل یا خضر مایہ الف۔ دوم زردی مائل سبز کلوروفل یا خضر مایہ ب۔ یہ دونوں رنگ تین اور ایک کی نسبت میں ہوتے ہیں۔ سوم نارنجی سرخ قروطین یا گجر مایہ۔ یہ رنگ گاجر کی جڑ میں کثرت سے ہوتا ہے۔ چہارم زرد زنتوفل یا زرد مایہ۔ خضر مایہ کی کثرت کی وجہ سے خضر دانے کا رنگ سبز ہی نظر آتا ہے۔ ان چاروں رنگوں میں سے مذکورہ بالا صرف دو کلوروفل ہی استحالہ کاربن کے لئے مفید ہیں۔

(۲) رنگین دانے۔ یہ دانے پودے کے حصوں کو زرد اور سرخ رنگ دیتے ہیں۔ خصوصاً پھول اور پھل کو یہ شکل میں خضر دانوں کی مانند ہوتے ہیں۔ لیکن ان سے چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ عموماً زرد اور نارنجی سرخ ہوتے ہیں جو زنتوفل یا قروطین کے اوپر منحصر ہے۔

(۳) پودے کے اندرونی حصوں میں جہاں روشنی کا گذر نہیں ہوتا بے رنگ دانے پائے جاتے ہیں یہ بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور اگر کسی وجہ سے یہ دانے روشنی کے سامنے آجائیں تو یہ بھی خضر دانوں میں منتقل ہو جاتے ہیں منجملہ اور کاموں کے بے رنگ دانوں کا ایک کام یہ ہے کہ وہ شکر کو نشاستہ[۵۸] میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ ایک جاندار کی نشو و نما کس طرح ہوتی ہے اور خانہ کی تقسیم کا کیا طریقہ ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں یہ خیال رکھنا چاہئے کہ نخزمایہ مادہ الحیات۔ مرکزہ۔ رنگ دانے وغیرہ کبھی غیر موجود شے سے خود بخود نہیں

---

۵۷ استحالہ کاربن کی بحث علم افعال الاعضاء کے اندر آتی ہے۔ لیکن مختصراً اسکی ترکیب یہ ہے کہ پودا روشنی میں کاربن ڈائی آکسڈ گیس اپنے اندر جذب کرتا ہے (اسی وجہ سے اس عمل کو شعاعی یا ضیائی ترکیب بھی کہتے ہیں) یہ گیس پودے کے اندر پانی سے مل کر فارملڈی ہائیڈ بنتا ہے اور آکسیجن گیس باہر نکلتا ہے۔ فارملڈی ہائیڈ کے چھ سالے ایک کیمیاوی ضابطہ کے ماتحت یکجا ہو کر شکر کے ایک سالمے کے اندر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ شکر پودے کی خوراک کے کام آتی ہے۔

۵۸ شکر نشاستہ میں تبدیل ہو کر پودے کی خوراک کے کام نہیں آسکتی۔ اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ جو شکر فوری خوراک سے زائد ہو وہ نشاستہ میں تبدیل ہو کر آئندہ ضرورت کے لئے محفوظ رہے۔ ضرورت کے وقت یہ نشاستہ کیمیاوی مرکبات کے ذریعہ سے جو پودے کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ پھر شکر کی صورت میں تبدیل ہو کر خوراک کے کام آسکتا ہے۔

بنتے۔ بلکہ ہمیشہ وہ اپنی موجودہ جنس سے تقسیم ہو کر ایک سے دو، دو سے چار اور چار سے آٹھ ہوتے ہیں۔ تقسیم کے طریقہ سے ایک خانہ سے متعدد خانے اور ایک مرکزے سے متعدد مرکزے ہونا ایک جسمیہ کا نشو و نما ہے۔

خانے کی تقسیم کے طریقے

اصل میں تقسیم کا عمل مرکزے سے شروع ہوتا ہے۔ مرکزے کی تقسیم کے دو طریقے ہیں۔ (۱) تقسیم مستقیم (۲) تقسیم غیر مستقیم۔

(۱) تقسیم مستقیم اس طرح ہوتی ہے کہ خانہ بڑھتے بڑھتے جب کافی حجم اختیار کر لیتا ہے تو مرکزہ بیچ میں سے کٹ کر دو، ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اس کے ارد گرد کا سیال اور خانہ کی جھلی بھی اسی طرح کٹ جاتی ہے اور تقسیم پوری ہو جاتی ہے۔

(۲) تقسیم غیر مستقیم ذرا پیچیدہ طریقہ ہے۔ مرکزہ کا باریک جال سمٹنے لگتا ہے اور یکجا ہو کر متعدد ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ یہ ٹکڑے شروع میں تار کی مانند ہوتے ہیں۔ لیکن بعد میں چھوٹے اور موٹے ہو جاتے ہیں۔ تب ہم ان کو لونی پارے کہتے ہیں (دیکھو تصویر نمبر ۳) پھر ہر ایک لونی پارہ طولی سطح سے دو برابر لونی پاروں میں تقسیم ہو جاتا ہے (تصویر نمبر ۴) اس طرح لونی پارے تعداد میں دو چند ہو کر خانے کی استوائی سطح پر برابر دو لائنوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ (تصویر نمبر ۵)

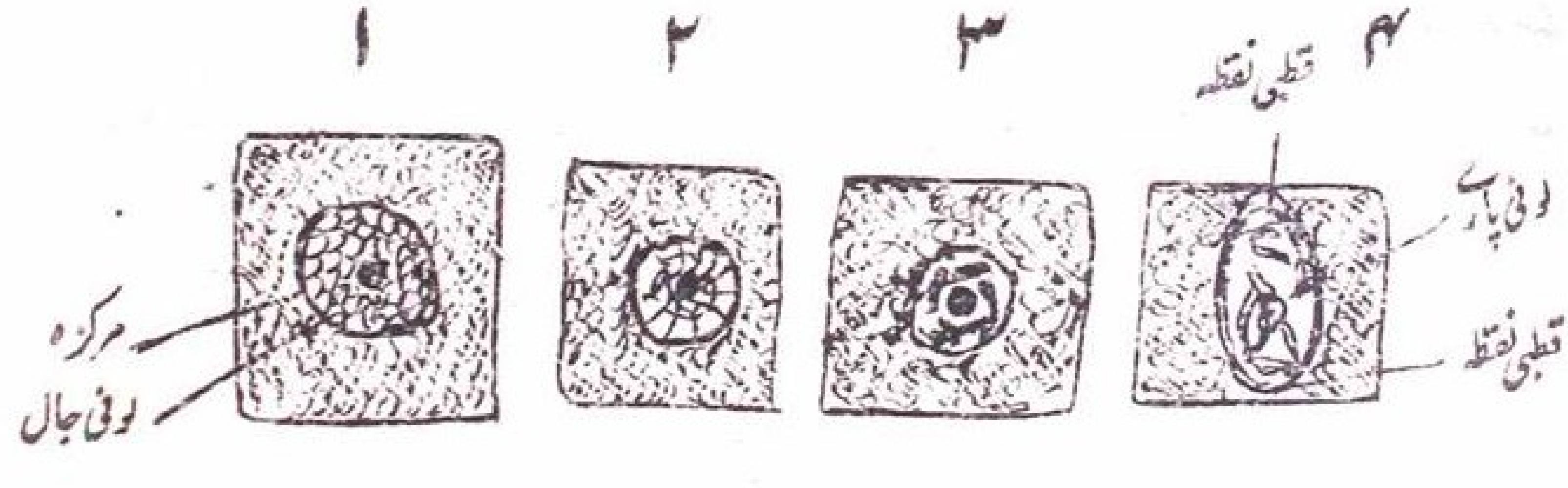

اسی درمیان میں مرکزے کے باہر یا الحیات کے تار مرکزی جھلی پر چمٹ کر اسکے اوپر ایک تہ بنا لیتے ہیں یہ تہ دو مقابل نقطوں پر ذرا ابھری ہوتی ہے۔ ان نقطوں کو ہم قطبی نقطے کہیں گے (تصویر نمبر ۴) اسوقت

مرکزی جھلی اور مرکزہ کو چک تحلیل ہوکر غائب ہوجاتے ہیں اور اس طرح قطبی نقطوں کے ریشوں کو مرکزی تسکم کے اندر بڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ اندر پہونچ کر یا تو یہ لونی پاروں سے مل جاتے ہیں یا ایک قطبی نقطہ کے ریشے دوسرے قطبی نقطہ کے ریشوں سے اس طرح مل جاتے ہیں کہ تکلے کے شکل کی ایک مسلسل لکیر قطبین کے درمیان قائم ہوجاتی ہے (تصویر نمبر ۵) اب ذرا لونی پاروں کی دونوں لائنوں پر غور کیجئے۔ یہ دونوں لائنیں، ایک دوسرے سے ہٹتے ہٹتے ایک اس قطب پر پہنچ جاتی ہے اور دوسری دوسرے قطب پر (تصویر ۶ و ۷) قطبین پہ لونی پاروں کے دو تودے بنجاتے ہیں اور مادالحیات ان کے چاروں طرف ایک جھلی بناکر انکو گھیر لیتا ہے۔ لونی پارے اس اثناء میں گڑبڑ ہوکر ایک جال کی شکل اختیار کر لیتے ہیں (تصویر نمبر ۸)۔ اب ایک مرکزے سے تقسیم ہوکر دو مرکزے تیار ہوگئے۔ یہ مرکزے بڑھ جاتے ہیں۔ اور ہر ایک کے اندر ایک ایک دو دو کو چک مرکزے پھر نمودار ہوجاتے ہیں۔ (تصویر نمبر ۹) جب لونی پارے قطبین پہ جمع ہوتے ہیں تو باریک باریک ذرے استوائی سطح پر جمع ہوجاتے ہیں۔ اور ایک جھلی بنا لیتے ہیں (تصویر ۷ و ۸) یہ جھلی بڑھتے بڑھتے خانہ کی دیواروں تک آجاتی ہے۔ جسوقت دو مرکزے مندرجہ بالا طریقہ سے تیار ہوجاتے ہیں تو یہ جھلی بیچ میں سے پھٹ جاتی ہے۔ یعنی پورا خانہ دو برابر خانوں میں تقسیم ہوجاتا ہے (تصویر نمبر ۹)

اوپر بیان کئے ہوئے مشاہدوں سے یہ بات طے ہوگئی ہے کہ حیات کے تمام مظاہرے خانہ کے سیال میں تخمایہ پر مبنی ہیں۔ کائنات میں ایسے بے شمار چھوٹے چھوٹے خوردبینی زندہ جیئے ہیں۔ جو صرف ایک ہی خانے کے بنے ہوئے ہیں۔ اور ان کے اندر پوری طرح حیات موجود ہے اور وہ زندگی کے تمام افعال اسی طرح ادا کرتے ہیں جس طرح کثیر الخانوی جانور۔ پودے اور درخت وغیرہ۔

شمعون احمد

طیار ہے

نگارستان
(جدید اڈیشن معہ کچھ اضافہ کے)
علاوہ محصول عہ
"مینیجر نگار"

شہاب کی سرگذشت
(نہایت خوبصورت جدید اڈیشن)
علاوہ محصول (عہ)
"مینیجر نگار"

روپ کا نشہ

اپنی سسرال میں بیوہ حمیدہ گذر کا کوئی سہارا نہ دیکھکر اپنے میکے آ گئی ظفر علی اپنی بیٹی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ وہ اپنے ضعیفی کا زمانہ تنہا کاٹ رہے تھے۔ بیوی کئی سال پہلے مرچکی تھی اب حمیدہ کے سوا ان کا دنیا میں اپنا کوئی عزیز نہ رہ گیا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ کچھ دنوں کے بعد حمیدہ کی کسی اچھی جگہ شادی کردینگے۔

آس پاس کے گاؤں میں ظفر علی ایک نامی پہلوان سمجھے جاتے تھے۔ کئی کشتیاں مار چکے تھے سینکڑوں شاگرد تھے۔ اس ضعیفی کے عالم میں بھی جب وہ لنگوٹ کس کر اکھاڑے میں کودتے تو جسم فولاد بن جاتا۔ ان کے داؤں پیچ کو دیکھ کر لوگ عش عش کرنے لگتے۔ کشتی سے ظفر کو عشق تھا اسکے علاوہ اسے اور کسی چیز کا شوق نہ تھا۔ اٹھتے بیٹھتے جب دیکھو تو کشتی ہی کی بات چیت۔ ان کے لئے یہ دنیا کشتی۔ اکھاڑہ اور پہلوان ہی کے لئے بنی تھی۔ اسی میں انھوں نے اپنا لڑکپن گذارا۔ جوانی ختم کی اور بڑھاپا آگیا۔ ماں باپ کے مرنے پر ظفر نے آنسوؤں کی دو چار بوندیں تو ضرور گرائی تھیں۔ لیکن اکھاڑے میں جانا آنا کبھی بند نہیں ہوا۔ اکلوتی لڑکی حمیدہ بیوہ ہوئی اس صدمہ سے ان کا کلیجہ پھٹ گیا لیکن اکھاڑے کی حاضری میں کوئی کمی نہ کی۔

کھانے پینے کی طرف سے ظفر کو بے فکری تھی۔ کھیتوں میں کافی اناج پیدا ہو جاتا۔ گھی دودھ کے لئے بھینس اور گائیں پلی تھیں۔ باہر کا کام شاگردوں سے کرا لیتے حمیدہ کے آنے سے گرہستی کی طرف سے بھی اطمینان ہو گیا۔ اور ظفر بڑی بیفکری سے اکھاڑے کا کام دیکھنے لگے۔ یوں تو سینکڑوں شاگرد تھے۔ لیکن عنایت سے بڑھکر ظفر کو اور کوئی عزیز نہ تھا۔ وہ ان کا شاگرد رشید تھا۔ پہلوانوں میں جو خوبیاں ہونی چاہیئے عنایت میں وہ سب موجود تھیں۔ بڑا خوبرو ہنس مکھ اور طاقتور جوان تھا۔ استاد ظفر اسکو اپنے لڑکے کی طرح سے مانتے تھے۔ اس پر انھیں اتنا اعتبار تھا کہ حمیدہ سے بھی کوئی پردہ نہ کراتے۔

استاد کے کام سے عنایت کو قریباً روزانہ گھر کے اندر جانا پڑتا۔ اس کو حمیدہ سے بھی باتیں کرنے کا موقع ملتا حمیدہ بھی اس سے بلا تکلف ملتی۔ عنایت اُسے اپنے اُستاد کی لڑکی سمجھتا اور حمیدہ اُسے اپنے باپ کا شاگرد رشید سمجھتی۔ عنایت حمیدہ کی طرف مودبانہ نظروں سے دیکھتا اور حمیدہ اس پر مہربان رہتی تھی۔ یہ ادب و مہربانی کے خیالات دونوں کے دلوں میں نہ معلوم کتنے دنوں تک جاگزیں رہے۔

خیالات دونوں کے دلوں میں نہ معلوم کتنے دنوں تک جاگزیں رہے۔

کچھ عرصہ کے بعد روزانہ میل ملاقات اور بات چیت سے ادب اور مہربانی میں نرمی آئی جس نے رفتہ رفتہ محبت کی شکل اختیار کرلی اور آخرکار وہ دن بھی آگیا جب عنایت اپنے استاد کی لڑکی کے دل و جان کا گاہک بن گیا اور حمیدہ بھی اُسے اپنے دل وجان کا مالک سمجھنے لگی۔

(۲)

حمیدہ نے جھنجلا کر کہا "ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ کہہ چکی اب مجھے زیادہ نہ دق کرو۔"

عنایت تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر دبی زبان سے کہنے لگا "کیا اور کوئی دوسری شرط نہیں ہوسکتی؟"

حمیدہ بولی "دوسری شرط؟ ہاں ہوسکتی ہے اور یہی سمجھ لیجئے۔ کیا تم ایک میان میں دو تلوار رکھنا چاہتے ہو؟"

عنایت۔ چھپ چھپا کر میں نے یہ کام کربھی دیا لیکن پولیس کو اگر اسکی خبر ہوگئی تو کیا ہوگا؟

"اسی میں تو تمہاری عقلمندی۔ چالاکی اور بہادری کا امتحان ہے۔ کیا تم بغیر ہاتھ پاؤں پھیلائے بہشت کا مزہ لوٹنا چاہتے ہو۔ پولیس کو خبر ہوجائے گی۔ تم اس بات سے اتنا ڈرتے کیوں ہو؟ پولیس تو روپے والوں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی ہے۔ روپے کے بل سے پولیس کو جدھر چاہو گھما سکتے ہو۔ بولو کیا سوچ رہے ہو۔ روپے کی کمی تو نہیں ہے؟"

"گناہ! اور سخت گناہ!!"

"گناہ سے کیوں ڈرتے ہو۔ گناہ بے لذت تو نہیں؟"

عنایت کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی۔ لیکن وہ فوراً ہی غائب ہوگئی وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہ سکا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ وہاں سے اُٹھ آیا۔

اس کے بعد کئی مہینے تک عنایت حمیدہ کے سامنے نہ گیا۔ روزانہ صبح اُٹھکر وہ استاد کے گھر جانیکے بجائے سیدھا اکھاڑے جاتا اور محنت کرکے گھر واپس آجاتا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اب عنایت میں وہ پہلا سا دم خم نہیں رہا۔ نہ اب وہ تیزی ہے اور نہ اب داؤں پیچ سیکھنے میں مستعدی۔ اس کا چہرہ نہایت متفکر رہنے لگا۔ غور و فکر سے چہرہ مرجھایا ہوا سا معلوم ہوتا تھا اور آنکھیں سب کو دیکھتی ہوئی بھی کہیں دوسری جگہ اٹکی ہوئی سی دکھائی دیتی تھیں۔ لیکن کسی نے عنایت سے کوئی پوچھ گچھ نہ کی۔ دن اسی طرح سے کٹنے لگے۔

(۳)

عنایت سو رہا تھا اس نے ایک خواب دیکھا۔ کتنا پیارا خواب تھا اُس نے دیکھا کہ وہ حمیدہ کو پا گیا ہے اور دونوں بڑی محبت سے بغلگیر ہو رہے ہیں وہ دونوں محبت آمیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ حمیدہ کے گل عارض آج کیسے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی ہرنی کی سی آنکھوں میں آج کتنا رس ہے۔ ہونٹوں پر تبسم اور آنکھوں میں مستی چھائی ہوئی ہے۔ عنایت کی طرف تاکتے تاکتے جب کبھی حمیدہ کی شرمیلی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں تو عنایت تڑپ جاتا ہے۔ حمیدہ کے سڈول و گداز بازوؤں میں آج جذبات کی بجلی تڑپ رہی ہے۔ دونوں آج کتنے خوش ہیں۔ پریم ساگر میں کتنا جوش و خروش ہے۔ عنایت اپنی محبت کی داستان سُناگیا۔ اپنی محبت کی بڑائی جتانا چاہتا ہے۔ اور حمیدہ اپنی پریم کتھا سُناکر عنایت کو شرماتی ہے۔ حمیدہ نے مسکرا کر کہا "لیکن ہو تم بڑے بیدرد!"

"وہ کیسے؟"

"کیا میں تمہاری بیدردی کی کہانی سُناکر اپنی زبان خراب کروں!"

حمیدہ کی یہ بات سُن کر عنایت کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ وہ نہ معلوم کس چنتا ساگر میں غوطے کھانے لگا۔ حمیدہ اس کے چہرہ کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہی تھی۔ عنایت بھی اسکی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن اب اس کے دل میں وہ پہلی سی خوشی نہ رہ گئی تھی۔ حمیدہ نے عنایت کے دل کی کیفیت کو تاڑ لیا۔ وہ ذکر چھیڑ کر پچھتانے لگی۔ کچھ دیر کے بعد بولی "اچھا جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب میں پھر تمہیں کبھی بیدرد نہ کہوں گی!!"

عنایت خاموش رہا۔ حمیدہ اسی طرح اس کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔ عنایت کے منہ سے اب گہری سانس نکلی۔ حمیدہ کے چہرہ پر بھی پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے اس نے گھبرا کر پوچھا "کاش کو تم نے اچھی طرح سے تو دفنا دیا ہے؟"

عنایت کا چہرہ زرد ہو گیا اسکی آنکھیں بیٹھ گئیں۔ وہ نہ جانے کیا جواب دینے والا تھا کہ اس کی زبان نہ کھلی۔ اس کے ساتھ ہی وہ خواب پریشاں دور ہو گیا۔ عنایت کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کا جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا دل زوروں سے دھڑک رہا تھا لیکن تھوڑی ہی دیر میں اس کے دل میں اطمینان او مسرت کی لہریں آنے لگیں۔ ڈوبتے ہوئے آدمی کو کچھ سہارا مل جانے پر جس طرح زندگی کی امید ہو جاتی ہے اسی طرح عنایت کو بھی ایسا معلوم ہوا کہ اُسے کچھ دیر پہلے والی مصیبت اور آفت سے بچانے والی کوئی چیز مل گئی ہے۔ جب وہ سمجھ گیا کہ یہ سب خواب تھا تو وہ جوش مسرت سے اُٹھ بیٹھا! اُسے یوں بھی مشکل سے نیند آیا کرتی تھی اور خاص کر آج جب اس کے دل میں طوفان جذبات اُٹھ رہے تھے کیسے نیند آسکتی تھی وہ بڑی دیر تک چارپائی پر بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ آخرکار وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ موقع آنے پر وہ حمیدہ کے لئے اپنی جان تک قربان کر سکتا ہے پھر وہ خواب کی جھوٹی باتوں پر آتا کیوں

ڈر گیا وہ اپنے اوپر ہنسے اور اپنی کمزوری پر لعنت بھیجنے لگا۔

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ اندھیری رات ہونے کی وجہ سے چاروں طرف تاریکی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جس بات کو وہ مہینوں سے سوچ رہا تھا اُسے پورا کرنے کے لئے عنایت کو وہ موقع نہایت مناسب معلوم ہوا وہ چارپائی سے اچھل پڑا۔ جس گنڈاسے کو وہ کام میں لانے کیلئے مہینوں سے تیز کرتا آرہا تھا اس نے اٹھا لیا اور ایک پل میں وہ صدر دروازہ پر پہنچ گیا۔ دروازہ بند تھا لیکن وہ اپنے خیال میں اتنا بیخود ہو رہا تھا کہ وہ سوچ ہی نہ سکا کہ دروازہ بند ہوگا۔ اس کی راہ میں ایک دیوار کھڑی ہو گئی وہ جھجک اُٹھا اُس نے سوچا "چھوٹی سی چھوٹی چیز جس کا بگاڑنا بنانا میرے ہاتھ میں ہے۔ اُسے میری راہ روکنے کا کیا حق حاصل ہے اُس نے جوش غضب میں گنڈاسے کو دروازے کے پلّے پر دے مارا۔ بڑے زور کی آواز آئی۔ گھر کے سب لوگ جاگ اُٹھے۔ عنایت کی بوڑھی ماں دروازہ پر "کیا ہے" کہتی ہوئی پہنچ گئی۔ عنایت کو اپنی غلطی معلوم ہو گئی۔ اُس نے ماں کے پوچھنے پر کہا "بہت زور کی پیاس لگی تھی۔ اندھیرے میں کچھ پتہ نہ چلا اور دروازہ میں زور سے دھکّا لگ گیا۔ ذرا پانی دیدے۔" گھر والوں کو اطمینان ہو گیا۔ پانی پلا کر اس کی ماں سونے چلی گئی۔ عنایت پھر اپنے دکھ سکھ کی فکر میں ڈوبنے اترانے لگا۔

(۴)

کئی دن کے بعد عنایت کو پھر اپنے دلی منشا کو پورا کرنے کا موقع ملا۔ وہ دبے پاؤں اپنی بیوی کے کمرے میں داخل ہوا اس کے ایک ہاتھ میں چمکتا ہوا گنڈاسہ اور دوسرے ہاتھ میں رسیوں کے کچھ ٹکڑے تھے اُس کی بیوی سو رہی تھی اور قریباً ایک سال کا ننھا بچہ بڑی بے فکری سے اپنی ماں کی گود میں محو خواب تھا۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے چاند کی کرنیں ماں اور بچہ پر پڑ رہی تھیں۔ عنایت چارپائی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ چاروں طرف سے گھوم کر اسکی نظریں بیوی کے چہرہ پر پڑیں۔ اس کے دل میں نیکی اور بدی کی جنگ شروع ہوئی۔ جس سے وہ کئی مہینوں سے نفرت کرتا آرہا تھا اور جس کا وہ آج خون کرنے آیا تھا آج اس کے چہرہ میں کچھ ایسا بھولا پن نظر آیا کہ عنایت سہم اٹھا۔ جس چہرہ کی طرف اُس نے کئی مہینے سے نہ دیکھا تھا وہی چہرہ آج چاند کی روشنی میں نہایت دلکش معلوم ہوا۔ وہ اپنی بیوی کے چہرہ کی طرف کچھ اور جھک گیا۔ کتنا معصوم اور پاکیزہ چہرہ ہے سہاگ رات میں بھی عنایت نے اسی طرح اپنی بیوی کا چہرہ سوتے میں دیکھا تھا۔ وہ دن، وہ گھڑی اُسے یاد آ گئی۔ بیوی کے گالوں پر شباب کی سُرخی جھلک رہی تھی۔ آہ میں بلا کسی خطا کسی قصور کے کیوں اپنی اس فرمانبردار اور حسین بیوی کا خون کرنے جا رہا ہوں، یہ سوچتے ہی عنایت کا دل بھر آیا اسے پھر اپنا گذرا ہوا زمانہ یاد آنے لگا۔ نکاح کی مبارک گھڑی یاد آئی۔ شروع میں وہ اپنی بیوی کو کتنا پیار کرتا تھا۔ بچہ کی پیدائش کا دن یاد آیا اس موقع پر جو خوشیاں منائی گئی تھیں ان کی تصویر بھی اُس کی آنکھوں کے سامنے آگئی۔ اس کے بعد

عنایت کو اپنا خواب بھی یاد آ گیا۔ عنایت کا دل کانپ اٹھا۔ اس کے ہاتھ سے گنڈاسہ چھوٹ گیا رسیاں اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ وہ کیا کرنے جا رہا تھا اس پر اس کا ضمیر ملامت کرنے لگا۔ جوانی کے جوش میں۔ مایا کے جال میں پھنس کر ایک سنگدل کی ظاہری حسن و ادا پر فریفتہ ہو کر وہ ایک معصوم چمن حسن کی شگفتہ کلی کو کچلنے جا رہا تھا۔ ایک شیر خوار بچے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ماں کی شفقت سے محروم کرنے جا رہا تھا۔ یہ سب باتیں یکبارگی عنایت کے دماغ میں آ گئیں اس کا دل موم ہو گیا تھا۔ آنکھیں بچہ اور اُس کی ماں پر لگی ہوئی تھیں اب عنایت کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو ڈبڈبی بوندیں گرنے لگیں۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گیا اس نے سوئے ہوئے ہنس مکھ بچے کو گود میں لیکر کلیجے سے لگا لیا۔ اور بڑی محبت سے بیوی کو جگا دیا۔ وہ چونک کر اُٹھی۔ اور اپنے سرتاج کو مدت کے بعد دیکھکر دبی زبان سے بولی۔ "بہت دنوں کے بعد یاد آئی۔ اللہ تیرا شکر ہے۔" عنایت چپ رہا۔ وہ جلدی میں سمجھ ہی نہ سکا کہ اُسے کیا جواب دینا چاہیئے۔ عورت کچھ گھبرائی اُس کے دل میں کچھ شک بھی ہوا۔ وہ قریب آ کر شوہر کے چہرہ کو بڑے غور سے دیکھنے لگی۔ عنایت اپنے گناہ کے داغوں کو آنسوؤں سے دھو رہا تھا۔ عورت کے پوچھنے پر ندامت کے آنسو اور بھی زور زور سے بہ نکلے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ خوف اور تعجب سے عورت کے ہوش اُڑے جا رہے تھے۔ شوہر کا ہاتھ تھام کر اس نے بڑی محبت سے کہا۔ "سچ بتاؤ کیا بات ہے۔ روتے کیوں ہو ہاتھ جوڑتی ہوں مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔" آہ کیسی پیاری آواز ہے۔ نہ کوئی تصنع ہے نہ بناوٹ۔ عنایت کا رونا بند نہ ہوا۔ بیوی نے پھر کہا۔ "آج کل تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ بتاتے کیوں نہیں۔ مجھ سے چھپاتے کیوں ہو۔ کیا تم مجھ سے کچھ ناراض ہو۔ اگر میں نے کوئی خطا کی ہو تو تم مجھے سزا دے دو لیکن خدا کے لئے رسول کے لئے اپنی جان ہلکان نہ کرو۔ ادل، تو تم اب شکل سے دیکھنے کو ملتے ہو اور ملے بھی تو اُداس اور پریشان حال۔ جسم سوکھ گیا۔ منھ پیلا پڑ گیا۔ کیا تمہیں خدانخواستہ کوئی بیماری ہو گئی ہے مجھ سے تو تمہیں کوئی بات چھپانی نہ چاہیئے۔ ہائے اللہ! میں تم کو کس طرح چپ کراؤں تم تو روتے ہی جا رہے ہو۔ مرد بھی کہیں روتے ہیں توبہ! توبہ!——"

رونے سے عنایت کا دل اب کچھ ہلکا ہو چلا تھا۔ ندامت کے آنسوؤں نے اس کے دل کو پاک و صاف بنا دیا تھا۔ اب اس میں نہ کوئی بُرائی تھی اور نہ کوئی فکر۔ پھر بھی لاکھ روکنے پر وہ اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکا۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "میں گنہگار ہوں۔ ظالم ہوں۔ جانتی ہو میں اس وقت یہاں کس نیت سے آیا تھا امیرن کی باتوں میں آ کر۔ روپ کے نشہ میں پاگل ہو کر تمہارا خون کرنے آیا تھا۔ دیکھو وہ گنڈاسہ پڑا ہے۔" عورت خوف سے کانپ اُٹھی اور اپنے ہاتھوں سے شوہر کے جسم کو خوب زور سے بھینچ لیا۔ عنایت نے اُس کے ہونٹوں پر محبت کی مہر لگا دی۔

(ماخوذ)

اعظم کریوی

نوادر ادب

(غالب کا غیر مطبوعہ کلام)

اسوقت غالب کے اُردو کلام کے دو مجموعے ملک میں نظر آتے ہیں، ایک وہ عام و متداول نسخہ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ مولانا عبدالحق خیرآبادی کے مشورہ سے غالب نے مرتب کیا تھا اور جس سے زیادہ ثقیل و دشوار اشعار نکال دئے تھے۔ دوسرا وہ جو نسخۂ حمیدیہ کے نام سے معروف ہے۔ اور جس کو ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے کتب خانۂ بھوپال کے ایک قدیم نسخہ کے مطابق مرتب کیا اور انجمن ترقی اُردو نے شائع کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نسخہ میں تمام وہ اشعار موجود ہیں۔ جن کو حذف کرنے کے بعد متداول نسخہ مرتب کیا گیا تھا۔

چونکہ کتب خانۂ بھوپال کا نسخہ جس کے مطابق نسخۂ حمیدیہ شائع کیا گیا ہے وہ ہے جسے خود غالب نے نواب بھوپال کے پاس حذف و اصلاح کے بعد روانہ کیا تھا، اس لئے خیال کیا جاتا تھا کہ اب کوئی حصہ کلام غالب کا ایسا نہیں ہے جو شائع ہونے سے رہگیا ہو۔ لیکن حال ہی میں ایک قلمی بیاض صدیق بکڈپو لکھنؤ کو ایسی دستیاب ہوئی ہے جس میں متعدد غزلیں غالب کی ایسی درج ہیں جو نہ متداول نسخہ میں پائی جاتی ہیں، نہ نسخۂ حمیدیہ میں۔

اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ واقعی یہ غزلیں غالب کی ہیں یا نہیں اور دوسرا یہ کہ اگر غالب ہی کی ہیں تو اس نسخہ میں کیوں نہیں پائی جاتیں جو بھوپال بھیجا گیا تھا۔ امر اول کے متعلق گفتگو فضول ہے۔ کیونکہ غالب کا رنگ سخن ایسا نہیں جو چھپا رہے اور جس پر دو رائیں قائم ہو سکیں۔ رہگیا امر ثانی سو یہ ہو سکتا ہے کہ بھوپال والے نسخہ کی ترتیب کے بعد غالب نے اور غزلیں کہی ہوں اور ان میں سے بعض کسی نے اس بیاض میں نقل کر لی ہوں یا پھر یہ غزلیں ہوں جو مختلف اوقات میں غالب نے بغیر مسودہ رکھے ہوئے کسی کو سنائی ہوں اور اُس نے محفوظ کر لیا ہو۔

بہرحال بیاض زیر بحث میں جتنی غزلیں پائی جاتی ہیں وہ یقیناً غالب کی ہیں۔ جیسا کہ اقتباس ذیل

سے ظاہر ہوگا۔ معلوم ہوا ہے کہ صدیق بک ڈپو ان کو مع ان کی شرح کے علیحدہ یا دیوان غالب کے ساتھ ہی شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

منتخب اشعار ملاحظہ ہوں :-

نیاز

کاش نادر نہ ہوتا مرا انداز خرام
میں غبار سر داماں فنا ہو جاتا

یک شبہ فرصت شوخی ہے اک آئینۂ غم
رنگ گل کاش گلستاں کی ہوا ہو جاتا

مستقل مرکز غم ہی پہ نہیں تھے ورنہ
ہم کو اندازۂ آئین وفا ہو جاتا

دست قدرت ہے مرا خشت بدیوار فنا
گر فنا بھی نہیں ہوتا تو فنا ہو جاتا

حیرت اندوزیٔ ارباب حقیقت مت پوچھ
جلوہ اک روز تو آئینہ نما ہو جاتا

آفت آہنگ ہے کچھ نالۂ بلبل ورنہ
پھول ہنس ہنس کے گلستاں میں فنا ہو جاتا

دعویٰ نیرنگیٔ آفاق نے مارا ہم کو
ہو گئے سب ستم و جور گوارا ہم کو

عجز ہی اصل میں تھا حاصل صد رنگ عروج
ذوق پستی مصیبت نے ابھارا ہم کو

دشت دشت میں نہ پایا کسی صورت سے سراغ
گرد جولان جنوں تک نے پکارا ہم کو

ضعف مشغول ہے بیکار بہ سعی بیجا
کر چکا جوش جنوں اب تو اشارا ہم کو

کچھ نہیں روز مصیبت بھی شب فرقت سے
ذرہ ذرہ میں نظر آتا ہے تارا ہم کو

تختۂ گور سفینہ کے مماثل ہے اسد
خواہش زیست نہیں آج دوبارا ہم کو

چاک زخم گل سے بھی رنگ تبسم ہے عیاں
بلبلوں کو سعی ناکارہ کا حاصل کیا ہوا

عمر سب بتخانہ میں نذر پرستش ہو گئی
اب ہوا بھی تو خیال حق و باطل کیا ہوا

سایہ ساں افتادگی تھی عجز بسمل کی دلیل
اے اسد زور آزما بازوئے قاتل کیا ہوا

نازش سرمایۂ عالم تھا نظر و منظر ہی
ہمنوا آخر مرے پہلو سے وہ دل کیا ہوا

ہر طرح جو نازش سرمایہ کونین تھا
کیا بتاؤں ہوا تجھ سے کہ وہ دل کیا ہوا

نسیم مصر جب کنعاں میں بوئے پیرہن لائی
پئے یعقوب ساتھ اپنے نوید جانِ تن لائی

وقارِ ماتم شب زندہ داری اس کو رکھنا تھا
سپیدی صبح غم کی دوش پر رکھ کر کفن لائی

وفا دامن کش پیرایۂ ہستی ہوا غالب
کہ پھر نزہت گہِ غربت سے تا حدِ وطن لائی

بدتر از ویرانہ ہے فصلِ خزاں میں صحن باغ
خانۂ بلبل بغیر از خندۂ گل بے چراغ

پتہ پتہ اب چمن کا انقلاب آموز ہے
نغمۂ مرغِ چمن ترا ہے صدائے بوم و زاغ

ہاں بغیر از خواب مرگ آسودگی ممکن نہیں
رختِ ہستی باندھ تا دنیا سے حاصل ہو فراغ

شورِ طوفانِ بلا ہے خندۂ بے اختیار
کیا ہے گل کی بے زبانی کیا ہے پروانہ کا داغ

چشم پرنم سے زمانہ منقلب ہے اے اسد
اب یہی ہے بس مے شادی پہ ہوتا ہے ایاغ

خزینہ دارِ مسرت ہوئی ہوائے چمن
بنائے خندۂ عشرت ہے بر بنائے چمن

بہ ہرزہ سنجی گلچیں نہ کھا فریبِ نظر
ترے خیال کی وسعت میں ہے فضائے چمن

بہ نغمہ سنجی بلبل متاعِ زحمت ہے
کہ گوشِ گل کو نہ راس آئے گی صدائے چمن

صدائے خندۂ گل تا قفس پہنچتی ہے
نسیمِ صبح سے سنتا ہوں ماجرائے چمن

گل ایک کاسۂ دریوزہ مشیت ہے
کہ عندلیب نوا سنج ہے گدائے چمن

بہار راہ رو جادۂ فنا ہے اسد
گل شگفتہ ہیں گویا کہ نقشِ پائے چمن

حریف نالۂ پُر درد ہے تو ہے پیہم بھی
ہے اک تبسم پنہاں ترا ادائے چمن

وفا جفا کی طلب گار ہوتی آئی ہے
ازل کے دن سے یہ اے یار ہوتی آئی ہے

جواب جنت بزم نشاط جاناں ہے
مری نگاہ جو خونبار ہوتی آئی ہے

نہ پوچھ حال اس انداز اس عتاب کے ساتھ
نہ پوچھ جان بھی آجائے گی جواب کے ساتھ
مجھے ستا کہ تمنا سے ہو نہ مایوسی
ملو رقیب سے لیکن ذرا حجاب کے ساتھ
نہ ہو بہ رہ روادار سعی بیہودہ
کہ دور عیش ہے قائم خیال و خواب کے ساتھ

بہ ضبط غم دل باعث مسرت ہے
ہوئے حسرت دل ہے ترے شباب کے ساتھ

یوں ہی افزائش وحشت کے جو ساماں ہونگے
دل کے سب زخم بھی ہمشکل گریباں ہونگے
وجہ مایوسی عاشق ہے تغافل اُن کا
نہ کبھی قتل کرینگے نہ پشیماں ہوں گے
گردش بخت نے مایوس کیا ہے ہم کو
اب بھی ہر گوشۂ دل میں کئی ارماں ہونگے
ہے ابھی خوں سے فقط گرمیٔ ہنگامۂ رنگ
پر یہ حالت ہے تو نالے شرر افشاں ہونگے
باندھ کر عہد وفا اتنا تنفر ہے ہے
تجھ سے بے مہر کم اے عمر گریزاں ہونگے
اس قدر بھی دل سوزاں کو نہ جان افسردہ
ابھی کچھ داغ تو اے شمع فروزاں ہونگے
عہد میں تیرے کہاں گرمیٔ ہنگامۂ عیش
گل مری قسمت واژونہ پہ خنداں ہونگے
خوگر عیش نہیں ہیں ترے برگشتہ نصیب
ان کو دشوار ہیں وہ کام جو آساں ہونگے

موت پھر زیست نہ ہو جائے یہ ڈر ہے غالب
وہ مری نعش پہ انگشت بدنداں ہونگے

کرم ہی کچھ سبب لطف و التفات نہیں
انھیں ہنسا کے رُلانا بھی کوئی بات نہیں
کہاں سے لا کے دکھائے گی عمر کم مایہ،
سیہ نصیب کو وہ دن کہ جس میں رات نہیں

روائی کی نہ دی تقدیر نے مقصد کو منظوری ۔ بہم رہنے لگی آخر تمنا اور مجبوری

حیا ہے مانع ذوق تماشا حسن کو لیکن نہیں مقبول شوق مضطرب دعوائے معذوری
زبان ذرہ محو شکوۂ مہر درخشاں ہے بایں انداز پیرا فتادگاں سے اسقدر دوری
امید التفات ناز مرنے بھی نہیں دیتی،
غرض یہ ہے کہ اے غالب کوئی حسرت نہو پوری

نمائش پردہ دار طرز بیداد تغافل ہے تسلی جان بلبل کیلئے خندیدن گل ہے
نمود عالم اسباب کیا ہے لفظ بے معنی، کہ ہستی کی طرح مجھکو عدم میں بھی تامل ہے
نہ رکھ پابند استغنا کو قیدی رسم عالم کا ترا دست دعا بھی رخنہ انداز توکل ہے
ابھی دیوانگی کا راز کہہ سکتے ہیں ناصح سے،
ابھی کچھ وقت ہی غالب ابھی فصل گل و مُل ہے

بھولے ہوئے جو غم ہیں اُنھیں یاد کیجیئے تب جاکے اُن سے شکوۂ بیداد کیجیئے
حالانکہ اب زباں میں نہیں طاقت فغاں
پر دل یہ چاہتا ہے کہ فریاد کیجیئے،

ہم سے خوبان جہاں پہلو تہی کرتے رہے ہم ہمیشہ مشق از خود رفتگی کرتے رہے
کثرت آرائی خیال ما سوائی وہم تھی مرگ پر غافل گمان زندگی کرتے رہے
شور نیرنگ بہار گلشن ہستی نہ پوچھ، ہم خوشی اکثر رہین ناخوشی کرتے رہے
رخصت اے تمکین بہ آرام فراق ہمرہاں
ہو سکا جب تک غم واماندگی کرتے رہے

درد ہو دل میں تو دوا کیجیئے، دل ہی جب درد ہو تو کیا کیجیئے
ہم کو فریاد کرنی آتی ہے، آپ سنتے نہیں تو کیا کیجیئے
عرض شوخی نشاط عالم ہے، حسن کو اور خود نما کیجیئے،
دشمنی ہو چکی بقدر وفا، اب حق دوستی ادا کیجیئے،

موت آنی ہی تھی کبھی غالب
کب تک افسوس زیست کا کیجئے

سکوت و خامشی اظہار حال بیزبانی ہو
کمین درد میں پوشیدہ راز شادمانی ہو

عشق بے پروا گرفتار خود آرائی نہ ہو گر کہیں گاہ نظر میں دل تماشائی نہ ہو
ہیچ ہے تاثیر عالمگیری ناز و ادا ذوق عاشق گر اسیر دام گیرائی نہ ہو
خود گداز شمع آغاز فروغ شمع ہے،
شورش غم در پئے ذوق شکیبائی نہ ہو،

اس جور و جفا پر بھی بدظن نہیں ہم تجھ سے کیا طرفہ تمنا ہے امید کرم تجھ سے
غالب کی وفا کیش اور تیری ستم رانی
مشہور زمانہ ہے اب کیا کہیں ہم تجھ سے

چوں شمع ہم اک سوختہ سامان وفا ہیں اور اس کے سوا کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہیں
اک سرحد معدوم ہے ہستی بھی ہماری
اور اس کے سوا کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہیں

گہوارۂ تمدن

(دوسرا اڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جس میں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے، اور دنیائے تہذیب و شائستگی اسکی کس قدر ممنون ہے۔ اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے۔ قیمت علاوہ محصول (۱۲ر)

منیجر "نگار" لکھنؤ

خیام کے چند اچھوتے جام

ہمارے فاضل دوست خان امتیاز علی عرشی رامپوری کے پاس خیام کی رباعیات کا ایک نہایت ہی نادر و عجیب و غریب نسخہ موجود ہے۔ جس سے اُنھوں نے چند غیر مطبوعہ رباعیاں ہمیں بھی اشاعت کے لئے روانہ کی ہیں۔ خیام کی رباعیات کا مسئلہ بھی نہایت ہی جھگڑے کا مسئلہ ہے، کوئی کہتا ہے اس کی بہت سی رباعیاں دوسروں کے کلام کے ساتھ مل گئیں کوئی مدعی ہے کہ بہت سی رباعیاں اس سے غلط منسوب ہیں۔ اور ابھی تک کوئی ایسا نسخہ نہیں دستیاب ہو سکا جو اس نزاع کا فیصلہ کر سکتا۔

ہمارے دوست خان امتیاز علی عرشی بھی آج کل اسی تحقیق میں مصروف ہیں۔ اور انھوں نے اپنے کتب خانہ کے ایک نادر نسخہ میں بہت سی ایسی رباعیاں پائی ہیں جن سے بحث کا ایک نیا دروازہ کھلتا ہے۔

ہم جدید رباعیات میں سے بعض اس جگہ درج کرتے ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ جناب عرشی کی جستجو کا نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے۔

نیاز

فراشِ چمن بادِ شمال است امروز
بے بادہ و گل عمر [1] بباد است امروز
می خور کہ باجماعۂ ہمہ اہل خرد
خونِ رز [2] (و) مال گل حلال است امروز

تحقیق فدانہ راز ہستی دارم
گو مرتبۂ ورائے ہستی دارم
بااین ہمہ دانش و خرد پندارم
اسرار جہاں جملہ نہ ہستی دارم

[1] قافیہ درست نہیں ہے۔ (عرشی) [2] واؤ اصل نسخہ میں ساقط ہے (عرشی)

چوں تیغ کشد، اجل، سپرہا ہیچ است
این محتشمی و سیم و زرہا ہیچ است
چنداں کہ ز روئے عقل در می نگریم،
نیک ست کہ نیک ست، دگرہا ہیچ است

بینا بہ سوادِ کفر و دیں می بیند
دانا ورقِ شک و یقیں می بیند
چوں نور بہ نگہ ز پردۂ یک عینک
آں می بیند ہرانچہ ایں می بیند

سطرے ز کتابِ عقل املا کردیم
چشمے بہ سوادِ عشق بینا کردیم
ایام حیاتِ ما چو دور ازیں حساب
تدنگے بود، تماشا کردیم

عمرے بحریم وصلِ بارم دادند
معراج کمالِ اعتبارم دادند
دیدند کہ مو بموئے من نقصاں بود
جبرم کردند و اختیارم دادند

رنگے ز گلِ گلاب دادند مرا
بوئے ز دلِ کباب دادند مرا
از شمع کہ در آتشِ من می سوزند
ہم شیشۂ و ہم شراب دادند مرا

عمر خیام نیشاپوری

رسالہ جن

کا دوسرا سال شروع ہو گیا ہے۔ اور زیادہ اہتمام کے ساتھ نکالا جا رہا ہے۔ اگر ابتک ملاحظہ نہیں فرمایا تو اب بھی۔ سال اول کے پرچے بحساب ۲/ فی پرچہ ملسکتے ہیں۔ چندہ سالانہ عہ/ ۔

منیجر جن لکھنؤ

نولکشور پریس کی ریڈریں

اور

منشی پریم چند کے احسانات اُردو پر

میں نے نگار کی کسی گذشتہ اشاعت میں نولکشور پریس کی ریڈروں کے متعلق ذکر کرتے ہوئے ظاہر کیا تھا کہ ہندو اشاعت گاہوں کی طرف سے اُردو زبان کی جو خدمت انجام دی جارہی ہے وہ حقیقتاً ہندو قومیت کی خدمت، ہندو ذہنیت کا مظاہرہ اور ہندو عصبیت کی تسکین ہے۔ آج کی صحبت میں مختصراً واقعات و مثال سے اس پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

اس وقت صوبۂ متحدہ میں سب سے بڑی ہندو اشاعت گاہ نولکشور پریس ہے اور یہ عرصہ سے وہ ریڈروں کی اشاعت کا کاروبار کر رہا ہے، لیکن گزشتہ چند سال کے اندر اس نے جس تدریج و رفتار کے ساتھ عہد نولکشور (بانی مطبع) کی صاف و صحیح اُردو کو غلط، ثقیل، سخیف و بازاری بنا دیا ہے۔ اس کا حال ان ریڈروں کے مطالعہ سے ہر ذی فہم کو معلوم ہو سکتا ہے۔

ان ریڈروں میں املا کی غلطی، تذکیر و تانیث کا عدم امتیاز، محاورات کا بے محل استعمال، متروک الفاظ کا صرف، بازاری الفاظ کی کثرت، اردو کے سادہ الفاظ کے بجائے قصداً سنسکرت کے ثقیل الفاظ کا استعمال، خالص بھاشا کی دقیق و مشکل نظمیں، تحریف واقعات، نفسیات تعلیم کے مخالف اسباق، الغرض وہ کیا ہے جو جناب پریم چند صاحب کی اصلاح و نگرانی میں شائع ہونے والی ان اُردو ریڈروں میں موجود نہیں ہے۔

جس وقت مینے یہ ظاہر کیا کہ مسٹر پریم چند اُردو کے محض ایک افسانہ نویس ہیں اور ان کو اس زبان کا ماہر یا ادیب نہیں کہا جا سکتا تو اُنھوں نے اس کو اپنی توہین قرار دے کر ایک غضب آلود مقالہ رسالۂ زمانہ میں میرے خلاف شائع کرایا، حالانکہ اُن کو معلوم ہونا چاہیئے (اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں نہایت ہی سنجیدگی

متانت سے کہہ رہا ہوں) کہ حقیقتاً وہ اُردو کے ماہر نہیں ہیں اور ان ریڈروں میں اُنہوں نے وہ وہ غلطیاں کی ہیں کہ اگر کوئی ایسا شخص ان کو دیکھے جو پریم چند صاحب کو نہیں جانتا تو ان ریڈروں کے لکھنے والے کو ادیب و ماہر زبان تو خیر کیا، معمولی پڑھا لکھا انسان بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اگر یہ ریڈریں وہی ہیں جن کے متعلق جناب نگم کی تحقیق یہ ہے کہ لکھنؤ کے ایک مشہور ادیب کے مشورہ سے پریم چند صاحب نے طیار کی ہیں تو میں حیران ہوں کہ ان تمام "نوادر و عجائب" کی فراہمی کا امتیاز کس کے لئے مخصوص سمجھا جائے؟

تاہم جب وقت ان فصیح و بلیغ فقروں پر نظر جاتی ہے کہ "مالا ڈال ___ منھ سے واہ نکل پڑتا ہے ___ بغداد، عرب کی راجدھانی تھی"

تو ان کے اندر چھپی ہوئی "بوٹے کچوری" پوری طرح غمازی کرجاتی ہے کہ ان برکات و فیوض کا سرچشمہ کہاں ہوسکتا ہے۔ کیا پرچہ سے پرچیاں بنانا اور دریچہ سے دریچیاں۔ اس ذہنیت پر خشک نہیں ہے جسنے

خسک سے بھی بند طاؤسنی جیب

(گھاس) (ہولی) (موری)

بہن لاگے قیصرن سے پانی کے ریلا،

(قیصری کی ہندی جمع)

قسم کی اردو بارہا پیدا کی اور ہمیشہ اسکی ہنسی اڑائی گئی۔

ان ریڈروں میں کثرت سے ایسے الفاظ بھی نظر آتے ہیں جو شرفا کی زبان پر نہیں ہیں۔ مثلاً لونڈا۔ اچھا لنا۔ کھاگ۔ سانٹھ گانٹھ۔ ممکن ہے کہ ریڈروں کے ترتیب دینے والے اپنی سادگی سے ان الفاظ کی سخافت کو نہ محسوس کریں، لیکن کوئی مسلمان شریف خاندان ایسا نہیں ہے جس کا بچہ بچہ اس حقیقت سے واقف نہ ہو۔

معنوی حیثیت سے جو مرتبہ ان ریڈروں کا ہے وہ اور زیادہ بلند ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ صداقت بیانیاں:-

لکھنؤ کے میڈیکل کالج کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ: "ایسا اونچے درجہ کا ڈاکٹری کالج ایشیا میں دوسرا نہیں ہے"۔

دوسری جگہ ایک اور صداقت کا اظہار یوں ہوتا ہے:-

"رامو کی عمر ۶ سال کی ہو گئی تھی، پر اُسنے کبھی چراغ نہ دیکھا تھا، اس کا گاؤں چھوٹا سا تھا"

(یعنی اتنا چھوٹا کہ اس میں ایک چراغ کی بھی گنجائش نہ تھی!!)

ایک جگہ فرماتے ہیں:-

"گوپال کا گھوڑا دیکھو اس کے دو ہی پر ہیں"۔

غریب لکھنے والا نہ صرف یہ کہ پیر، پاؤں، اور ٹانگ کے فرق سے نابلد ہے، بلکہ یہ بھی نہیں جانتا کہ اصول تعلیم کے لحاظ سے ایسی خلاف حقیقت باتیں بچوں کے سامنے لانا حد درجہ گمراہ کن ہے۔

ان ریڈروں کی زبان و انشاء کے متعلق ایک عام خیال قائم کرنے کے لئے ذیل کے فقرے ملاحظہ ہوں:۔

"وہ بڑا گھمنڈی تھا —— ایک کوٹھری میں روٹی بنتی ہے۔ لوگ سوتے بیٹھتے ہیں۔ آنگن میں لوٹتے ہیں —— کھانا دیر سے بنا تھا —— کل سے ہی میں تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں —— مٹھائیوں کا راجہ کہیں تو ٹھیک ہے۔ تب بیلوں کو جھگڑ کر کھیت میں ہل جوتتا ہوں۔ گرمی کی دوپہری —— ایک تو دوسری بہت دیر میں آتی ہے۔ آپ کی کرپا سے۔ لیکن پیرائی کا ڈول نہیں جم رہا ہے —— آپ بندریا پر کتنا رعب گانٹھ رہے ہیں۔ ایسے پاپی جانور —— رامو اچرج بھری آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ تھوڑی دیر پیچھے پھر کہا —— راج سو گیا گیا۔ رسوئی بنانے کے لئے بھوجن بھنڈار ہیں —— ادب سے پرنام کر کے بولے —— کھیدا کیا جاتا ہے —— کوئلہ کی کئی کھانیں ہیں —— کسی جگہ اکال پڑ جائے —— پرانا گھاگ —— ممبروں کا چناؤ۔ پرچیاں گنی جاتی ہیں —— بڑا بھاری اپرادھ ہوا ہے۔ دانی لوگ کنوئیں اور تالاب بنواتے ہیں۔

کیا بر کھا جب کرسی سوکھا نے —— کریا اچھر بھینس برابر،

گرمی کی دوپہری ہیں —— مویشیوں کے لئے گھیان کیسے نہیں —— کولوں میں خرچہ بہت پڑتا ہے گردن میں ایک مالا ڈال لی —— کمبل اور چادرے تھے —— آپس میں دھکم دھکا کرتیں۔ بولی کی دانتوں میں نہیں ہوتیں —— انیشور سے پرارتھنا کرنے لگا —— اس بپتا سے بچاؤ —— تو پھر پرشاد ملے گا —— ایک کنستر یا ٹوکنا سر پر جا سکتا ہے —— سمو چا نگل جاتی ہے —— [illegible] کتنا بڑے ہتین دونے بنائے —— ماموں کو ماما جی کہو چچا کو چاچا جی کہو —— دو اداروں کی —— [illegible] سے سکتے تک نہیں ہیں —— پورے دھرتی پر چکر لگایا کرتے کھانا بھی کوئلہ ہی سے بنتا ہے —— اگر کھرپی کدال ہی کرنا ہے —— معاملہ بیڈھب آن پڑا تھا۔ جان بھاری پڑی ہے —— پریت پوجا ان کا دھرم تھا —— بڑا بھاری اپرادھ ہوا ہے —— دیہات کا سدھار ——

ان کو دیکھ کر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ زبان و انشاء کی وہ کون سی خوبی ایسی ہے جو ان میں نہیں پائی جاتی اور کون ایسا وشٹ و پاپی ایسا ہے جو نولکشور پریس اور مسٹر پریم چند کو ایسا بے بہا سرمایۂ ادب رکھنے والی ریڈروں کی اشاعت پر مبارکباد نہ دے۔

بعض لیڈروں میں اشعار بھی خیر سے زیبِ قرطاس کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ کس حصۂ ملک کی اردو کے ہیں اس کا انکشاف اب تک نہیں ہو سکا۔ ملاحظہ ہوں:-

چڑھتے برسے ادرا، اُترت برسے ہست
کتنوں راجہ ڈانڈے باندھے سُکھی رہے گرہست
دین ورا جاوہی وہ دیس جہاں برسے اگہن سیس
پاس میں دونا ماگھ سوائی، پھاگن برسے گھر سے جائی،
ساون پُروا بجاودں پروا کنوار بہے ایسان کاتک، ماسے سینگ ڈولے کہاں رکھو گے دہیان
تکرار کی بادری رہی سنیچر چھائے کہے گھاگھ سن گھاگنی بن برسے نہیں جائے
ادرا تو برسے نہیں مرگسیرا بونہ جوئے تو یہ سمجھو بھڈولی بکھا بوند نہ ہوئے
ساون پہلی پنچمی جو چالے آتی پون، نہیں بسے یہ دیس میں اچھی کرتو گون،
ساون کرشن اکادشی گرج میگھ ادھ رات تم جاؤ پیا مالوے ہم جاویں گجرات

یہ وہ غلطیاں ہیں جو بیک نگاہ چن لی گئیں، ورنہ اگر پوری طرح استقصا کیا جائے تو ہر ریڈر کے ساتھ اسی کے برابر ایک غلط نامہ مرتب کرکے شامل کیا جا سکتا ہے۔ حیرت ہے کہ ان کارناموں کے بعد بھی اصرار کیا جاتا ہے کہ ہندو اشاعت گاہوں کو اردو کا بھی خواہ سمجھا جائے اور پریم چند صاحب کو ادیب ماہر زبان

شرم آنکھ، نگہ بستہ اور چتون منحرج
تم اپنی فکر، تو پیدا کرو حیا کیلئے

نیاز

صحابیات

جس میں عہد رسالت کی ۵۰ خواتین کے مستند حالات یکجا کر دئے گئے ہیں۔ اس کا مقدمہ مولانا نیاز نے خاص اپنی انشاء میں اس قدر جوش و ترتیب کے ساتھ لکھا ہے کہ مسئلہ نسائیت کے بہت سے نکات اس سے حل ہو جاتے ہیں۔ قیمت علاوہ محصول (عہ)

منیجر "نگار" لکھنؤ،

مطبوعات موصولہ

HINDUSTANI PHONETICS

جناب سید محی الدین قادری زور ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی نے انگریزی میں یہ رسالہ اس موضوع پر لکھا ہے کہ دکن کے اہل علم کی اُردو زبان کا لہجہ کیا تھا۔

جناب زور حیدر آباد کے اُن مخصوص طلبہ میں سے ہیں۔ جنھوں نے ولایت جاکر صحیح معنے میں علم حاصل کیا اور دوسروں کو اس سے مستفید کیا۔ آپ نے وہاں لسانیات کی اعلےٰ ڈگری لینے کے بعد بھی سلسلۂ تحقیق و تفتیش جاری رکھا ہے۔ جس کا بالکل تازہ نتیجہ یہ کتاب ہے۔

اس موضوع پر غالباً یہ بالکل پہلی کتاب ہے۔ اور اگر اُردو میں ہوتی تو ہم کہتے کہ یقیناً ———

جناب زور نے پہلے تاریخی روشنی اس مسئلہ پر ڈالی ہے اور شمالی و جنوبی لٹ لہجہ کے اختلاف سے بحث کی ہے۔ اس کے بعد کے تین ابواب میں محض صوتیات سے متعلق ایک جامع گفتگو کی گئی ہے۔

یہ کتاب پیرس میں طبع کرائی گئی ہے۔ جہاں آج کل جناب زور مقیم ہیں۔ لیکن مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن سے بھی دستیاب ہو سکتی ہے۔

علاؤالدین خلجی

جناب سلطان حمید صاحب ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی ساکن اٹاوہ نے انگریزی میں علاؤالدین خلجی کے حالات پر یہ کتاب تحریر فرمائی ہے۔

علاؤالدین کو تاریخ ہند میں جو اہمیت حاصل ہے کسی سے مخفی نہیں۔ کیونکہ ہندوستان کا وہ دور انتہائی اضطراب کا دور تھا اور علاؤالدین نے اسی زمانہ میں نہایت کامیاب حکومت کی اور نظم و نسق کی ایسی مزین مثالیں اس نے قائم کیں کہ مشکل ہی سے کوئی دوسری نظیر اسکی ملسکتی ہے۔

ہمیں مسرت ہے کہ جناب سلطان حمید صاحب نے اس کتاب کو اصل ماخذ سے مرتب کیا ہے اور کافی دادِ تحقیق دی ہے۔ ضرورت ہے کہ مدارس انگریزی میں اس قسم کی تاریخی کتابوں کو جگہ دی جائے۔ مغربی مصنفین کی تصانیف تاریخ کافی طور پر یہاں کی آبادی کے دل و دماغ کو مسموم کر چکی ہیں۔

دولت غزنویہ

مولفہ مولوی محمود الرحمان صاحب ندوی۔ چھوٹی تقطیع کے ۳۹۳ صفحات کو محیط ہے اور دو روپیہ میں کتب خانہ دارالادب لاہور سے مل سکتی ہے

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کتاب میں دولت غزنوی کی تاریخ درج کی گئی ہے، لیکن غالب حصہ محمود کے حالات و تذکرہ کا ہے، کیونکہ حقیقتاً دولت غزنوی عبارت ہے ایک اوسی کی ذات سے۔

محمود غزنوی کو انگریزی مصنفین نے صرف ایک بت شکن کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اور اس میں کلام نہیں کہ واقعہ سومنات سے اس کی اس حیثیت کو زیادہ نمایاں کرنے کا موقع سیاسی مورخین کو ملجاتا ہے، لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ محمود میں رواداری عفو و درگزر بھی اس حد تک تھا کہ اگر اسکی بت شکنی کے ساتھ ساتھ اس پر نگاہ ڈالی جائے تو خود بت پرست قوم اس کی عزت کرنے پر مجبور ہوسکتی ہے۔

مولوی صاحب موصوف نے اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھکر یہ تاریخ لکھی ہے اور کافی داد تحقیق دی ہے، ہر چند حوالہ کے اظہار کی پابندی نہیں کی گئی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب میں اصل ماخذوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، عبارت بہت صاف و شگفتہ ہے اور انداز بیان دلچسپ طباعت و کتابت بھی کافی دلکش ہے۔

نیرنگ زمانہ

تذکرہ ہے دور جہانگیری کی اس مہتم بالشان و جلیل القدر ہستی کا جس کا اصل نام زمانہ بیگ تھا اور جو بعد کو موتمن الدولہ خانخاناں سپہ سالار اعظم نواب مہابت خاں کے طویل الذیل القاب و خطابات سے مشہور ہوا۔

عہد جہانگیری میں کوئی اہم یا قابل ذکر واقعہ ایسا نہیں ہوا جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح مہابت خاں سے نہ رہا ہو، اور اسی لئے اس زمانہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کیلئے ناگزیر ہے کہ وہ صفحات تاریخ میں بار بار مہابت خاں کا نام پڑھے۔ لیکن چونکہ تاریخ کے واقعات منتشر ہوتے ہیں، اس لئے اُن کو یکجا کرکے کسی ایک ہستی کے متعلق مخصوص واقعات و حالات کو سلسلہ و ترتیب سے مرتب کردینا آسان کام نہیں، بنابراں ملک کو شکر گزار ہونا چاہیئے جناب شیخ علی حسن صاحب منصرم ریاست محمود آباد کا جنھوں نے اس مشکل فرض کو نہایت خوبی سے انجام دیا اور ایک خوبصورت کتاب کی شکل میں مہابت خاں کے حالات زندگی کو جو تزک جہانگیری، جہانگیر نامہ، شاہجہاں نامہ، سیر المتاخرین، ماثر الامراء اور دربار اکبری وغیرہ میں منتشر طور پر پائے جاتے تھے یکجا کردیا۔

اس کتاب کے ۲۱۹ صفحات ہیں، لیکن عبارت اس قدر شگفتہ، انداز بیان ایسا دلچسپ ہے کہ مشکل ہی سے ایک شخص اس کو شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے رہ سکتا ہے، جا بجا مفید حواشی سے

اس کتاب کی اہمیت کو اور زیادہ بڑھا دیا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے، لیکن محترم صاحب موصوف سے خط و کتابت کرنے پر معلوم ہو سکتی ہے۔

تاریخ ریاست حیدر آباد دکن ہمارے صوبہ متحدہ کے مشہور مصنف و مورخ مولوی محمد نجم الدین خانصاحب رامپور کی تالیف ہے جو ۷۶۲ صفحات میں ختم ہوئی ہے۔ اس تالیف کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں دکن کی جغرافی و طبعی خصوصیات کے علاوہ خاندان آصف جاہی کے مورث اعلےٰ عابد خاں تاتاری سے لیکر سید محمد خاں صلابت جنگ تک کے تمام واقعات و حالات درج کئے گئے ہیں اور اسی سلسلہ میں عہد محمد شاہ کی تاریخ بھی ضمناً آگئی ہے۔ اور مرہٹوں کا خروج اور احمد شاہ درانی کی حملہ آرائیاں بھی بیان کی گئی ہیں۔ دوسرے حصہ میں میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی سے لیکر آصف سابع (موجودہ فرمانروائے دکن) تک کے زمانہ کو لیکر تمام واقعات و حالات کا اس قدر جزوی استقصاء کیا گیا ہے کہ فاضل مولف کی محنت و کاوش کی بے اختیار داد دینا پڑتی ہے۔

دکن کی تاریخ، تاریخ ہند کی ایسی اہم کڑی ہے کہ جب تک اس کا مطالعہ نہ کیا جائے، اس عہد کی سیاسیات کا سمجھنا محال ہے، اور اس نکتہ کو اس قدر تکمیل کے ساتھ اس تاریخ میں پیش نظر رکھا گیا ہے کہ اگر تاریخ ہند کا ایک حصہ اس کو قرار دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

الغرض یہ کتاب دکن کی جغرافی، آثاری، تاریخی، معاشری، ادبی اور سیاسی حالات کی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ جس پر فاضل مولف کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کی تکمیل میں مولوی صاحب موصوف کو عربی، فارسی اور اردو کی تقریباً سو تصانیف کا مطالعہ کرنا پڑا۔ جن میں بعض تصانیف وہ ہیں جو عام طور سے دستیاب بھی نہیں ہوتیں۔

یہ کتاب نولکشور پریس لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

تاریخ مغربی یورپ ترجمہ ہے ڈاکٹر رابنسن کی کتاب کا جسے فاضل مترجم مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی نے کسی وقت سبقاً سبقاً پڑھا تھا۔ اس کتاب میں گویا سلطنت روما کی پراگندگی شیرازہ کی تاریخ بیان کی گئی ہے جو یورپ کے موجودہ سلطنتوں کے قیام کا باعث ہوئی تھی۔ اور اس میں کلام نہیں کہ باوجود اس قدر ایجاز کے جس تفصیل سے مصنف نے کام لیا ہے وہ موجودہ فن تاریخ نویسی کا خاص کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

ترجمہ کو میں نے کہیں کہیں سے دیکھا تو بڑی حد تک صاف و شگفتہ پایا۔ البتہ کہیں کہیں انگریزی کے الفاظ بجنسہ باقی رکھے گئے ہیں اور ان کا مفہوم بھی نہیں بتایا گیا۔

طباعت کتابت بہت پاکیزہ ہے اور مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی سے ۸؎ میں ملسکتی ہے۔

سیرۃ نبوی اور مستشرقین

ترجمہ ہے برٹانکا کے اس آرٹکل کا جو محمدؐ ازم کے عنوان سے مشہور مستشرق ولباوزن نے لکھا ہے۔ اس کے مترجم مولوی عبدالعلیم احراری نے جا بجا حواشی کا اضافہ کرکے اُن اغلاط کا بھی ازالہ کر دیا ہے۔ جو ولباوزن سے سرزد ہوئی ہیں۔ ابتدا میں ایک دلچسپ مقدمہ بھی فاضل مترجم کا ہے۔

یہ کتاب بھی مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی سے (۱۲؎) میں مل سکتی ہے۔

انتخاب سودا

جناب ثاقب کانپوری نے ایک تمہید و مقدمہ کے ساتھ سودا کے کلام کا انتخاب اس نام سے کیا ہے۔ اور جامعہ ملیہ دہلی نے اسکی اشاعت کی ہے۔

اس انتخاب میں صرف اُس کی غزلیں اور رباعیات نظر آتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ قصائد کے لئے علیحدہ کوشش کی جائے گی۔ سودا کا جو مرتبہ دنیائے شعر و شاعری میں ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، اسلئے یقیناً جناب ثاقب کی سعی سے مشکور ہونا چاہیئے۔

انتخاب بُرا نہیں ہے۔ اور مقدمہ بھی کافی شگفتہ و دلچسپ ہے، لیکن تاریخی حیثیت سے زیادہ چھان بین کی ضرورت تھی۔

اصل الاصول فی الاستناد بقول الرسول

پنجاب میں مذہبی مناظروں کے لحاظ سے امرتسر کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو شہادت حسینؑ کے سلسلہ میں کوفہ کو حاصل ہوا کہ وہی مرکز علومئین کا بھی تھا اور خوارج کا بھی۔

ایک زمانہ سے امرتسر میں دو جماعتیں چلی آرہی ہیں۔ ایک وہ جو اپنے آپ کو اہل حدیث کہتی ہے اور دوسری وہ جو اہل قرآن کے نام سے موسوم ہے۔ اول الذکر کے سرگروہ مولانا ثناء اللہ صاحب ہیں اور دوسرے کے مولانا اسد الدین صاحب۔

کچھ عرصہ ہوا، ان دونوں کے درمیان حدیث کی صحت قرار دئے جانے پر ایک مباحثہ ہوا جسپر مولانا سید محمود علی صاحب بی۔ اے ریسرچ اسکالر جج کپورتھلہ نے ایک محاکمہ اصل الاصول فی الاستناد بقول الرسول کے نام سے تحریر فرمایا ہے۔ مولانا محمود علی صاحب ملک کے مشہور اہل فکر و قلم ہیں اور اصول مذہب عقائد پر بھی ان کے بعض رسائل مقبول ہو چکے ہیں۔ اس لئے وہ یقیناً اس مباحثہ میں محاکمہ تحریر فرمانے کے اہل تھے اور جو کچھ اُنھوں نے لکھا ہے وہ متانت و سنجیدگی، استدلال و استنتاج کے اصول سے بہت خوب ہے اور وہ حضرات جنھوں نے اس قسم کی مناظرہ کرنے والوں کا بیان دیکھا ہے اِن کے لئے ضروری ہے کہ مولانا محمود علی صاحب

کے اس محاکمہ کو بھی دیکھیں - ہر چند مجھے جزواً ان تینوں حضرات سے اختلاف ہے - لیکن اصولاً لا اصول میں یقیناً بعض باتیں ضرور ایسی نظر آتی ہیں جو اس طرح کے معمولی اختلافات کو دور کر کے مرکز مشترک پر سب کو لا سکتی ہیں - اس کی قیمت ۸ ہے اور رسالہ پیام اسلام جالندھر سے مل سکتا ہے -

ہندو اخلاقیات ترجمہ ہے جی - اے چند اور کر بی - اے کی کتاب کا جسے مولوی غلام ربانی صاحب مدرس مدرسہ نارمل اسکول اورنگ آباد نے اردو میں کیا ہے - اس کتاب میں نہ صرف ویدوں اور اپنشدوں کی اخلاقی تعلیم سے بحث کی گئی ہے - بلکہ منو - والمیکی - مہابھارت - شنکراچاریہ بھگوت گیتا - بھرتری ہری اور بودھ کے اصول اخلاق پر بھی بسیط گفتگو نظر آتی ہے - میری رائے میں اس کتاب کا مطالعہ ہر مسلمان کو کرنا چاہیئے تاکہ وہ اپنی ہمسایہ قوم کے مذہبی اصول اور اخلاقی تعلیمات سے آشنا ہو کر تنگدلی و عصبیت سے بچ سکے - یہ کتاب (عـ۱۲؍) میں پروہت اینڈ کو کتب فروش ریذیڈنسی بازار حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے -

پرانا خواب درد و افسانہ مجموعہ ہے ملک کے مشہور ادیب سید سجاد حیدر بی - اے کے تین افسانوں کا جو ترکی زبان سے ترجمہ کئے گئے ہیں -

جناب یلدرم کو جو قدرت ترکی زبان پر حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں اور اسی طرح یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ ترکی زبان کی انشاء لطیف کس قدر پاکیزہ و بلند چیز ہے - اس لئے ظاہر ہے کہ جس کتاب میں ایسا پاکیزہ اقتران ہو جائے وہ کیا کچھ نہ ہوگی -

اس میں پہلا مضمون پرانا خواب ایک ڈرامہ کا ترجمہ ہے اور باقی دو آسیب الفت اور مطلوب حسینان فسانے ہیں یہ مجموعہ (عـہ) میں مسلم یونیورسٹی پریس علی گڈھ سے مل سکتا ہے -

نقش و نگار یعنی جناب جلیل احمد صاحب قدوائی بی - اے (علیگ) کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ جو (عـہ) میں مسلم یونیورسٹی پریس سے مل سکتا ہے - اس مجموعہ میں بارہ نظمیں ہیں ۴۵ غزلیں اور دس رباعیاں شروع میں حسب دستور جدید ایک تعارف نامہ ہے جناب احسن مارہروی کی طرف سے اور ایک مقدمہ ہے جناب عبدالشکور صاحب کے قلم سے -

اس سے قبل بھی کسی وقت ہم جناب جلیل کے کلام پر ریویو کرتے ہوئے اس کی تعریف کر چکے ہیں - اور اب پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ جلیل قدوائی کی غزلیں صحیح معنے میں تغزل کی کیفیت رکھتی ہیں اور حسرت موہانی کے رنگ کو اس قدر تکمیل کے ساتھ نباہنے والا شاید ہی کوئی دوسرا ہو - ان کی نظموں میں بھی جذبات نگاری کا وہی عالم ہے اور رباعیوں میں بھی -

یہ مجموعہ ہر چند بہت مختصر ہے لیکن یکسر انتخاب ہی انتخاب ہے۔

پطرس کے مضامین

اس خوبصورت کتاب میں دارالاشاعت پنجاب لاہور نے اپنے صوبہ کے مشہور مزاحیہ نگار جناب پطرس کے گیارہ مضامین مجلد کر دئے ہیں۔ جناب پطرس کا اصل نام احمد شاہ بخاری ہے جو کیمبرج کے گریجویٹ ہیں اور لاہور کے مشہور اہل علم و ذوق میں شمار کئے جاتے ہیں۔ پنجاب کے مختلف رسائل میں ان کے مزاحیہ مضامین شائع ہو کر درجۂ قبول حاصل کر چکے ہیں۔ دیباچہ کی چند ابتدائی سطروں میں آپ لکھتے ہیں کہ:-

"اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں، اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھکر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔

اگر حماقت کو حق بجانب ثابت کرنا، حماقت کی تکرار نہ ہوتی، تو میں بھی اس کتاب کو یقیناً اچھا کہدیتا۔ مگر برا بھی نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اس طرح اس احسان کی اہمیت کم ہوجانے کا اندیشہ ہے جو دارالاشاعت پنجاب نے میرے پاس مفت بھیجکر جناب پطرس پر کیا ہے۔

گائے اور اسکی قربانی

اس مختصر رسالہ میں مولوی اکبر شاہ خانصاحب نجیب آبادی نے گائے کے متعلق جس قدر لغوی و تاریخی تحقیقات ہو سکتی تھی یکجا کر دی ہے اور یہ ثابت کرتے ہوئے کہ گائے کی عظمت کا عقیدتاً شرک و کفر کے باقیات میں سے ہے، ہندوؤں کی مقدس کتابوں سے اس حقیقت کو ظاہر کیا ہے کہ انھوں نے خود گائے ذبح کی اور کثرت سے ذبح کرکے اس کا گوشت کھایا اور مہمانوں کو کھلایا۔ اخیر میں ہندوؤں کو مخاطب کرکے مشورہ دیا ہے کہ قربانی گاؤ کے باب میں ان کا تشدد مصلحت کے خلاف ہے اور نہ حقیقتاً زراعت کو اس سے نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ رسالہ ۸ر میں منیجر عبرت نجیب آباد سے مل سکتا ہے۔

وید اور اُسکی قدامت

یہ رسالہ بھی مولوی اکبر شاہ خانصاحب کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے لسانیات، تاریخی روایات اور مذہبی تعلیمات کو سامنے رکھ کر ثابت کیا ہے کہ وید کو قدیم ماننا درست نہیں، کیونکہ وہ حقیقتاً مجوسیوں کی تعلیمات سے ماخوذ ہیں۔ یہ رسالہ بھی ۸ر میں منیجر عبرت نجیب آباد سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

عبادت اور اُسکی غایت

یہ نام ہے تفسیر سورۂ فاتحہ کا جسے ہمارے فاضل دوست میرزا ابوالفضل نے مرتب کیا ہے، اور منیجر صاحب کتابستان (ریلی روڈ۔ الہ آباد) نے شائع کیا ہے۔

کتاب ٹائپ میں نہایت نفیس کاغذ پر طبع ہوئی ہے اور مجلد شائع کی گئی ہے۔

جن لوگوں نے جناب میرزا ابوالفضل کی مذہبی تصانیف کو دیکھا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کتاب کا رنگ کیا ہوگا اسکے فاضل مصنف اس جماعت میں شامل ہیں جو مسلمانوں میں مذہبی اصلاح کی حامی ہے لیکن جدید اصول پر اسی لئے انکے تمام تصانیف میں ایک خاص جدت پائی جاتی ہے۔ جو حضرات قرآن کو قرآن ہی کے ذریعہ سے سمجھنا چاہتے ہیں ان کو اسکا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔ قیمت ۸ر اسکے تمام محاسن کو دیکھتے ہوئے زیادہ نہیں ہے۔

رنج و راحت چودھری سردار خاں صاحب پسروری نے چند اسباق درستی اخلاق کے متعلق اس رسالہ میں یکجا کر دئے ہیں، لیکن اسکے مطالعہ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ مقصود اس کتاب کی اشاعت سے بچوں کو درس دینا ہے یا ذی فہم لوگوں کو۔ اگر بچے مخاطب ہیں تو زبان اور جا بجا کثرت سے اشعار کی بھرتی ناموزوں ہے اور اگر خطاب ذی شعور لوگوں سے ہے۔ تو مطالب و طریق ادا اس پایہ کے نہیں ہیں۔ اسکی قیمت ایک روپیہ رکھی گئی ہے۔ جو معمولی تقطیع کے ۲ جزو کے لئے بہت زیادہ ہے۔

اسلامی روایات جناب محمد حفیظ اللہ صاحب نے تاریخ اسلامی سے مختلف و متعدد اخلاقی واقعات و روایات اس رسالہ میں یکجا کر دئے ہیں۔ جو معنی و مفہوم اور زبان کے ہر لحاظ سے یقیناً اس قابل ہیں کہ ان کو اسلامی درسگاہوں میں رواج دیا جائے۔ ۸ر میں مسلم بک ڈپو پھلواری شریف سے ملسکتا ہے۔

ISLAMIA BROTHER HOOD یہ ترجمہ ہے انگریزی میں جناب محمد حفیظ اللہ کی کتاب اسلامی مساوات کا جس پر اس سے قبل نگار میں ریویو ہو چکا ہے۔ اس کے مترجم مولوی عبد الغنی صاحب اور مسلم بک ڈپو (پھلواری) نے اسے بھی شائع کیا ہے۔

تعلیم اسلام ایک مختصر سا مذہبی رسالہ ہے۔ جس کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے، مولوی سید معین الدین صاحب اس کے مصنف ہیں اور نظامی پریس بدایوں نے اسے شائع کیا ہے۔ رسالہ موضوع کے لحاظ سے اچھا اور تحقیق استدلال کے لحاظ سے غنیمت ہے۔

محاسن اسلام مرزا عبد القادر بیگ صاحب وکیل اجمیر کا وہ لکچر ہے جو آریہ سماج اجمیر کی دعوت پر آپ نے ۱۹۲۸ء میں پڑھا تھا۔ اور (۲؎) آنہ میں دفتر تبلیغ اسلام اجمیر سے ملسکتا ہے۔

نور الحق۔ الناموس المفصل رسالہ پیام اسلام جالندھر میں ایک حصہ تفسیر کے لئے بھی وقف ہے اسی میں سے سورۃ الفلق اور سورۃ المزمل کی تفسیر کے ...

رسالوں کے علیحدہ شائع کی گئی ہیں۔ یہ تفسیر مولوی محمد نور الحق صاحب کا نتیجۂ فکر ہے۔ اور اُردو کی تمام موجودہ تفاسیر میں ایک خاص امتیاز کی صورت رکھتی ہے۔ مطالب بلند کو نہایت صاف و پاکیزہ انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ رسالے علی الترتیب دو آنے (۲ر) اور چار آنے (۴ر) میں منیجر پیام اسلام سے مل سکتے ہیں۔

بجائے کارخانہ مشین سویاں قادیان (پنجاب) کے اب ہمارا پتہ ہندوستانی ایجاد گھر دھلی ہے

تحفہ عید مبارک

خلاف تحریر ہو تو قیمت واپس

ہمارے کارخانہ قائم شدہ سنہ ۱۹۱۴ء کی تیار کردہ مقبول عام پیتل کی خوبصورت پالش شدہ منٹوں میں سیروں نفیس و لذیذ رومالی سویاں تیار کرنے والی

نو ایجاد مشین سویاں

وزن کم حجم معمولی

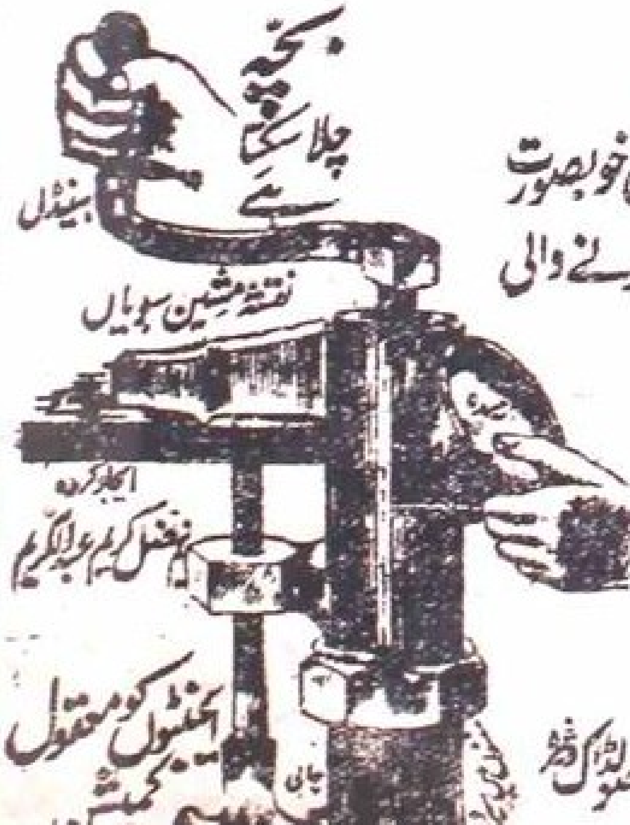

قیمت فی مشین پیتل پالش شدہ چھلنی دو عدد (سوراخ ۲۰) ملے، علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ:- ہندوستانی ایجاد گھر دھلی

باب الاستفسار

مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں

(جناب محمد علیم الدین صاحب۔ مدراس)

عرصہ ہوا آپ نے صفحات نگار میں عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا جسکی کافی مخالفت ہوئی تھی۔ لیکن جہانتک مجھے یاد ہے آپ کی اس تحقیق کا تعلق صرف قرآنی روایات اور مذہبی عقائد سے تھا لیکن ضرورت اسکی معلوم ہوتی ہے کہ مذہب سے بالکل علحدہ ہو کر شخص ثالث کی حیثیت سے غور کیا جائے کہ تحقیق تاریخی اس مسئلہ میں کیا کہتی ہے اگر وقت ہو تو کبھی اس طرف بھی توجہ فرمائے۔

(نگار) آپ کا یہ استفسار بہت زمانہ سے میرے پاس محفوظ تھا اور چونکہ آپ نے ایک نہایت ہی اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلائی تھی اسلئے میں وقت و موقعہ کا منتظر رہا۔

دسمبر ۳۰ء کی نصف شب گزر چکی تھی، کلیساؤں کے گھنٹے سال نو کی آمد کا اعلان کر رہے تھے کہ دفعۃً آنکھ کھلی اور میرا خیال اس رسم کلیسائی سے مذہب عیسوی کی طرف منتقل ہوا اور پھر جناب مسیح کی مقدس ہستی سامنے آئی۔ اسی کے ساتھ آپ کے اس استفسار کا خیال آیا اور میں نے یہی مناسب سمجھا کہ سالِ نو کا آغاز اسی گفتگو سے کیا جائے اور اس لئے اسکی اولین ساعت میں اسکی طرح ڈالدی گئی۔

چونکہ مبحث نہایت اہم و تفصیل طلب تھا، ضرورت وقت و فرصت کی تھی اور بدقسمتی سے یہی زمانہ میرے لئے بہت زیادہ مصروفیت و انہماک کا ہوتا ہے، اس لئے میں نہ جلد اسکو ختم کر سکا اور نہ شاید نگار کی ایک اشاعت میں اسکو پیش کر سکوں، بہرحال تعمیل ارشاد میں اسکی ابتدا فروری کے نگار سے کرتا ہوں اور نہیں کہہ سکتا کہ کبتک اس کا سلسلہ قائم رہے، لیکن چونکہ گفتگو غیر دلچسپ نہ ہوگی اس لئے امید ہے کہ آپ اور دیگر ناظرین نگار اس سے گھبرائینگے نہیں اور کافی غور و تامل کے ساتھ بحث کے تمام پہلوؤں پر نگاہ ڈالیں گے، کیونکہ مقصود صرف تحقیق حق ہے جو عصبیت و قومیت کی قیود سے بہت بلند چیز ہے۔

مذاہب عالم کی تاریخ میں سب سے زیادہ عجیب غریب اور پُرلطف واقعہ، جو اس وقت بھی بعض زندہ مذاہب کے عقائد و تعلیمات کا ایک جزو ضروری سمجھا جاتا ہے، مسیح ناصری کے وجود کا ہے۔ ان کے واقعۂ پیدائش سے لیکر صلیب پر چڑھائے جانے تک بلکہ اسکے بعد بھی ان کے آسمان پر اُٹھا لئے جانے اور پھر دوبارہ روئے زمین پر نزول اجلال فرمانے تک جو کچھ بیان کیا جاتا ہے، وہ اسقدر دلچسپ ہے کہ بسا اوقات اسکی اہمیت مشتبہ معلوم ہونے لگتی ہے اور ذہن مجبور ہو جاتا ہے کہ اسکی "رومانیت" سے علیحدہ ہو کر بھی کبھی غور کرے کہ جو کچھ مسیح کے متعلق مذہبی کتابوں میں بیان کیا جاتا ہے اسمیں واقعی کوئی اصلیت ہے یا صرف "دیو و پری" کی سی کہانیاں ہیں، جو غلطی سے داخل مذہب ہو گئی ہیں؟

اس مسئلہ پر گفتگو کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم اپنے آپ کو عیسوی مذہب یا کسی اور ایسے مذہب کا سچا معتقد سمجھ کر جو اس واقعہ کی صحت کا مؤید ہے، پہلے ہی سے یہ یقین کر لیں کہ جو کچھ ان مذاہب کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے وہ حقیقت ہے اور بغیر کسی تاویل و حجت یا تبصرہ و تنقید کے مان لینے کے قابل ہے، اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مذہب و مذہبیت سے بالکل خالی الذہن ہو کر تاریخی و علمی تحقیق کو ذریعہ یقین بنائیں۔ اس میں شک نہیں کہ اول الذکر صورت ضمیر انسانی کے لئے بہت محفوظ و معصوم کیفیت رکھتی ہے، لیکن جس حد تک علم و تحقیق کی جستجو متعلق ہے، اسکی کمزوری کسی سے مخفی نہیں اور وہ ایک لمحہ کیلئے بھی اُس ذہن کو مطمئن نہیں کر سکتی جسے خود سمجھ کر کسی بات کے ماننے کا چسکا پڑ گیا ہے۔

کئی سال ہوئے نگار کے باب الاستفسار میں مسیح کے متعلق قرآن کے بیانات سے بحث کر کے اپنے خیالات ظاہر کر چکا ہوں جس نے مسلمان و عیسائی دونوں طبقوں میں ہیجان برپا کر دیا اور اسکے جواب میں بعض مشنری سوسائٹیوں نے مطبوعہ پمفلٹ ملک کے عرض و طول میں ہر جگہ مفت تقسیم کئے، کیونکہ جو کچھ میں نے لکھا تھا وہ اُن عام قصص و روایات کے خلاف تھا جو دونوں جماعتیں صحیح باور کرتی ہیں اور میری تحریر اُنکے نزدیک اصول مذہب کو درہم برہم کرنیوالی تھی۔

میں نے جو کچھ لکھا تھا وہ یہ تھا کہ قرآن سے اُن روایات کی تصدیق نہیں ہوتی جو جناب مسیح کی پیدائش، وفات، احیاء ثانیہ وغیرہ کے متعلق عیسائیوں میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن چونکہ قرآن سے تاویل کے بعد یا بغیر تاویل کے ایک شخص اُن روایات کی صحت بھی کر سکتا ہے، اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ مذہبی روایات سے ہٹ کر تاریخی و علمی جستجو کیجائے اور پھر معلوم کیا جائے کہ حقیقت کیا نکلتی ہے۔ اگر نتیجہ وہی نکلے جو پہلے عرض کر چکا ہوں تو اسکے معنی یہ ہونگے کہ قرآن کی آیات کا مفہوم جو میں نے ظاہر کیا تھا وہی صحیح ہے اور اسکے علاوہ جو کچھ بیان کیا جاتا ہے درست نہیں کیونکہ اس صورت میں علم و تاریخ دونوں کی شہادت میرے بیان کو قوی تر بنا دیگی اور پھر غالباً کسی کو انکار کی گنجائش نہ ہوگی۔ آج کی صحبت میں اس نقطۂ نظر سے بحث کرونگا امید ہے کہ ناظرین نگار بحث کے ہر ٹکڑے کو غور سے پڑھیں گے اور خود بھی اپنی جگہ یہ معلوم کرنیکی کوشش کرینگے کہ میں جس نتیجہ پر پہونچا ہوں وہ غلط تو نہیں ہے۔

چونکہ یسوع ناصری کی حیات و وفات کے متعلق جو حالات دنیا کو معلوم ہوئے ہیں وہ اناجیل اربعہ یا صحائف (عہدنامہ جدید) کے ذریعہ سے معلوم ہوئے ہیں۔ اسلئے سب سے پہلے ہمکو یہ دیکھنا چاہئے کہ خود اناجیل اربعہ کی کیا اہمیت ہے اور ان پر کس حد تک

اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

آپ کسی بڑے سے بڑے ماہر انجیل یا عیسائی سے دریافت کیجئے کہ انجیلوں کا مصنف کون تھا تو وہ کوئی یقینی جواب نہ دے سکیگا۔ کیونکہ حقیقتاً آج تک بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ انجیلوں کا اصل لکھنے والا کون ہے۔ کیونکہ ہر انجیل کے عنوان پر "بقول متی" یا "حسب بیان متی" درج ہے اور "مصنفہ متی" کہیں نہیں لکھا گیا۔ بعض کا خیال ہے کہ تیسری انجیل واقعی لوقا کی ذاتی تحقیق کا نتیجہ تھی۔ لیکن خود لوقا کا بیان یہ ہے کہ "میں ان بیانات کا عینی شاہد نہیں ہوں۔ بلکہ جس طرح مجھ سے قبل اور بہت سے آدمیوں نے یسوع کے حالات قلمبند کئے ہیں، اسی طرح میں بھی کرتا ہوں"۔

انجیلیں چار ہیں۔ مرقس، متی، لوقا، یوحنا۔ ان میں سے سب سے پرانی انجیل مرقس کی مانی جاتی ہے۔ جو مسیح کے تقریباً ستر سال بعد لکھی گئی، اس کے بعد متی اور لوقا کی انجیلیں ہیں جو ۹۰ سال بعد مرتب کی گئیں اور پھر یوحنا کی انجیل ہے جو دوسری صدی کی پیداوار ہے، اچھا اب آیئے اُن روایات پر پہلے ایک تنقیدی نگاہ ڈال لیں جو مسیح کے باب میں ان انجیلوں کے اندر پائی جاتی ہیں۔

کنواری کے پیٹ سے پیدا ہونا اور مرکر دوبارہ زندہ ہونا یہی دو خاص واقعے مسیح کے متعلق ایسے ہیں جو معجزہ کی صورت سے بیان کئے جاتے ہیں، لیکن ان دونوں باتوں کی جو شہادتیں اناجیل میں پائی جاتی ہیں انمیں باہم سخت اختلاف ہے۔ انجیل مرقس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سب سے پرانی انجیل ہے اور اس میں سب سے زیادہ صاف حال بیان کیا گیا ہے، لیکن شاید یہ سُنکر حیرت ہو گی کہ یہی انجیل تحریفات کا دفتر بے پایاں ہے۔ اس انجیل کا قدیم ترین نسخہ وہ ہے جو باب ۱۶ آیت ۸ پر ختم ہو جاتا ہے اور آخری باب کا باقی حصہ کسی اور شخص نے بعد میں اضافہ کیا ہے، کیونکہ اس حصہ کا طرز تحریر نہ صرف یہ کہ ابتدائی حصہ سے بالکل علیحدہ ہے بلکہ اس کی تردید بھی کرتا ہے۔ مثلاً ساتویں آیت میں ایک فرشتہ عورتوں سے کہتا ہے کہ "تم جاؤ اپنا راستہ لو، اسکے شاگردوں اور پطرس سے کہدو کہ وہ تم سے پہلے شہر جلیل کو جائے گا اور تم اُسے وہیں دیکھو گے جیسا کہ اُس نے تم سے کہا تھا" قدیم مصنف انجیل کا بیان ہے کہ یہ بات ان تینوں عورتوں میں سے کسی نے نہیں کہی، کیونکہ وہ ڈرتی تھیں، لیکن جدید مصنف کا بیان ہے کہ ایک عورت کو یسوع کا دیدار ہوا اور اُس نے یسوع کے شاگردوں سے یہ ماجرا بیان کیا، لیکن کسی نے یقین نہیں کیا، چنانچہ اسکے بعد یسوع نے کسی دوسرے پیکر میں اپنے شاگردوں سے گفتگو کی مگر کسی کو یقین نہ آیا حالانکہ بقول مرقس، یسوع نے ان لوگوں سے اپنے دوبارہ جی اُٹھنے کی پیشین گوئی کر دی تھی۔

(باقی)

سفینۂ کاغذیں

تیز تند اور سخت بارش نے بہا دیں ندیاں
ننھی ننھی، ٹیڑھی ترچھی نالیاں جاری ہوئیں
غسل کر ڈالا فضائی بستیوں نے نور سے
لہر سی اُٹھی ہوائیں، پتیاں رقصاں ہوئیں
ہر خوشی سی چھا گئی دنیا کی حسِ عیش پر
زندگی تازہ ہر شے میں نظر آنے لگی
آسماں کی سرحدیں گہرائیوں سے مل گئیں
غول در غول آن بیٹھے مرغہائے رنگ رنگ
گانوں کے بچوں کو دی آواز فطرت نے کہ ہاں!

ہر گلی کوچہ نظر آنے لگا اک آب زار
جھیل بستی کی بنی غیرت دہ آبِ تتار
چہرۂ خورشید و مہ سے دُھل گیا گرد و غبار
موجیں اُمڈیں سطحِ دریا پر قطار اندر قطار
وسعتِ صحرا میں لہرانے لگے لاکھوں شرار
ذرہ ذرہ سے ہویدا ہو گیا رنگِ بہار
قوسِ رنگیں میں ہوئی محرابِ گردوں آشکار
روِشِ صحنِ گلستاں ہو گیا دریا کنار
اپنی بھولی شوخیوں سے ڈال دو آ کر بکار

ماں کی آغوشِ محبت سے اُٹھے طفلانِ شوخ
اوس کے قطروں سے زائد صاف چہروں میں خوشی
آبِ کوثر سے کہیں میٹھی نگاہوں سے عیاں
سادہ شوخی اسطرح ہر ہر ادا سے آشکار
ڈور دوپ اور کھیل میں مصروف اس انداز سے

چار جانب کھیل کی پریوں میں جا کر مل گئے
اس طرح روشن نظر آتی تھی جیسے ننھے
ماورائے خاک کی مخلوق ہو ننھے پتے
عکسِ رنگِ شوخ جیسے تتلیوں کے باغ سے
جیسے سطحِ آب پر رقصاں ہوں ننھے بلبلے

ننھے فرخ نے بنایا اک سفینہ کاغذیں
ناؤ پانی پر گری، اور گر کے کچھ ساکن ہوئی
اس طرح ساکت تصادم سے ہوئے نغمے بلند
حلقہ ہائے سیم پے در پے بنے اور مٹ گئے

لے خدا کا نام پانی کے حوالہ کر دیا
جس سے ہلکا سا تموج سطح پر پیدا ہوا
جیسے فردوسی فضا میں اُس گرنے کی صدا
دامہائے گیسوئے حورا کا نقشہ کھنچ گیا

عنبریں موجیں اُٹھیں ساحل سے بادِ سرد کی — چادرِ آبی پہ کشتی نے ذرا پلٹا لیا
چار جانب دیکھتی رکتی ہوئی چلنے لگی — ننھا فرخ اس خوشی میں آپ سے باہر ہوا
اُنہی اٹھلاتی چلی جیسے کہیں فردوس میں — چشمۂ کوثر میں کوئی حور ہو محوِ شنا
یا کہیں اپنے محل میں مچھلیوں کا بادشاہ — ملکۂ آبی کو پہلو میں لئے ہو ناچتا

~~~~~~~~~~~~~~

بھولے فرخ! ناؤ کاغذ کی کبھی چلتی نہیں — مجھ سے سن تو جسپہ بھولا ہے وہ ہے وہم و خیال
تیری سادہ آرزو جس پہ سفر کرنے کو ہے — آہ! اس کشتی کو پانی پہ ٹھہرنا ہے محال
دیکھ، ننھے سے بھنور میں اسکو چکر آگیا — پیاری پیاری اُنگلیوں سے جا اسے جا کر سنبھال
اف!! تھپیڑا کھا کے کیسی غرقِ دریا ہوگئی — اس محیطِ بیکراں میں روک اگر ہو کچھ مجال
میں نہ کہتا تھا نہ کر اپنا کھلونا رائیگاں — غم نہ کھا، ناداں، نہ دیگا فائدہ رنج و ملال
غور کر، تجھ کو ابھی دنیا میں رہنا ہے بہت — گوشِ دل وا کن بحرفِ من، کہ مُردانم مقال

~~~~~~~~~~~~~~

تیری کشتی نے مجھے سمجھا دیا رازِ حیات — پھر گیا آنکھوں میں میری عمرِ فانی کا سماں
کشتیِ عمرِ رواں کو بحرِ فانی ہے محیط، — چار جانب ہیں نہنگانِ بلا آتش فشاں
اک طرف امواجِ طوفاں آسمان سے ہم سخن — دوسری جانب سے عفریت ہوا حملہ کناں
لقمۂ تر جان کر گدھ سر پہ منڈلاتے ہوئے — اور منھ کھولے ہوئے پانی کے اندر مچھلیاں
عالمِ اسباب میں رہ کر جدا اسباب سے — ناخدا ناپید، ساحل دور، منزل بے نشاں
غرقِ دریا ہونیوالی ہے یہ کشتی بھی ضرور — آہ! اکدن پڑھنے والے ہیں یہ ہم پر نوحہ خواں

~~~~~~~~~~~~~~

جن کے آوازے سے پُر تھا یہ جہانِ آب و گل — آج ڈھونڈے سے نہیں ملتا کہیں اُنکا نشاں
آج بیشِ خارِ صحرا بھی نہیں ان کو نصیب — قالبِ گل میں بناتے تھے جو اپنا آشیاں

مردمِ چند آمدہ زیرِ سما آسودہ اند
بودہ اند، اما حبابِ سطحِ دریا بودہ اند

خان امتیاز علی عرشی
~~~~~~~~~~~~~~

پیامِ زندگی

پیکرِ خاکی میں اک پرجوش احساسِ کمال
سینۂ گیتی میں بل کھاتی ہوئی روحِ جمال

ساز کے تاروں میں نغموں کا سکوتِ بیقرار
روح میں سعی و عمل کا عنصرِ فانی اضطرار

پنکھڑی کی نبض میں تعمیرِ گلشن کا لہو
قلبِ خس میں پھول بنجانیکی پنہاں آرزو

حلقۂ ظلمت میں دورِ بادۂ صبحِ جمال
قلب کی گہرائیوں میں جنبشِ موجِ خیال

رات کی افسردگی میں جلوۂ ماہِ منیر
موت کی سنسان وادی میں سرودِ جوئے شیر

خاک کے ذرات میں رقصِ شعاعِ آفتاب
ساغرِ بے رنگ میں رخشانیٔ موجِ شراب

پستیوں کے ساز میں اک نغمۂ اوجِ کمال
نرم موجوں میں بلند آہنگ طوفاں کا جلال

صبح کی آغوش میں بڑھتے ہوئے سورج کی ضو
خواب کے اجزا میں گرم رقص بیداری کی رو

جہل کے سائے میں انوارِ بصیرت کی دمک
شام کے پردوں میں حسنِ صبح گاہی کی جھلک

نیلگوں اک سطح پر، حیرت فزا رقصِ نجوم
اک دلِ ویراں میں لاکھوں آرزوؤں کے ہجوم

زندگی کیا ہے، کمالِ اہتمامِ کائنات
لے گئی ہے سرمدی اجزا سے ترتیبِ حیات

اُٹھ کہ ہیں پھر صبح کی رنگینیاں جنت فروش
مل رہی ہے نیند کے ہاتھوں کو پھر صہبائے ہوش

ذرہ ذرہ انتظارِ رقص میں بیتاب ہے　　پتہ پتہ کیف کے احساس سے شاداب ہے
چھا رہا ہے پھر خس و خاشاک پر ابرِ نمو　　دوڑتا ہے خار کی نبضوں میں خونِ رنگ و بو
کر رہا ہے طرزِ نو ایجاد فطرت کا دماغ　　جل رہا ہے بزمِ ظلمت میں بصیرت کا چراغ
اک پیامِ وجد ہے نورس شگوفوں کی چٹک　　تو بھی سن سکتا ہے ناداں! نبضِ فطرت کی ہمک

اُٹھ! کہ آخر تا کُجا مرگ آشنا رنگِ سکوت
تجھ سے دُنیا چاہتی ہے زندگانی کا ثبوت

گرچہ ہے سازِ مسرت کا ترنم دلنشیں　　زندگی تنہا نشاط و شادمانی میں نہیں
یوں نہیں، صرف اک گریۂ پیہم نہیں رازِ حیات　　زندگی رکھتی ہے ان اوہام سے برتر صفات
دہر کی ترتیب ہے اک مستقل آئین پر　　منظرِ ذرات سے تا جنبشِ موجِ گہر
عشرتِ سرشار ہو یا تلخیٔ صہبائے غم　　زندگی کی مختلف راہوں کے ہیں یہ پیچ و خم
دیدۂ بیدار ہے آسودۂ خوابِ گراں　　تو ہے اور یہ سطح پر پھیلی ہوئی تاریکیاں
اے رہینِ خاک، مہرِ ضو فشاں ہے زندگی　　نبضِ دل میں گردشِ خونِ جواں ہے زندگی
زندگی! اقلیمِ پستی کا نشانِ امتیاز　　موت سے آزاد ہے سود و زیاں سے بے نیاز
وقفِ صہبائے عمل ہیں کیفیاتِ زندگی　　زندگی، یعنی نہیں ہیں حادثاتِ زندگی
منزلیں، آباد ہوتی ہیں اُجڑنے کیلئے　　سطح کا ہر نقش ہے بننے بگڑنے کیلئے

زندگی لیکن نہیں صرفِ شکستِ انفعال
زندگی ہے بیخبر! اک سرمدی نقشِ جمال

خاک سی، ہر سمت اُڑتی ہے خزاں آئینکو ہے
آسماں پر گھر کے رحمت کی گھٹائیں چھا چکیں
نرم موجیں، صرفۂ اجزائے طوفاں ہو چکیں

مطمئن ہو تو، بہار شادماں جائینکو ہے
بجلیاں تیری نشیمن پر بہت لہرا چکیں
مسکرا کر صبح کی کلیاں پریشاں ہو چکیں

دیکھ تو کیا کہہ رہی ہے، فطرتِ آزادہ کار
یہ بھی کوئی زندگی ہے خستہ و زار و تباہ
سرنگوں سازِ عمل ہے گوشہ گیری پر تری

اے اسیرِ حلقۂ دامِ غلط ہوشیار
موت کا، نادان! ہو جس زندگی پر اشتباہ
ذرہ ذرہ مسکراتا ہے اسیری پر تری

سوزِ بربادی، نہ اطمینان آبادی میں ہے
بیخبر! یہ اعترافِ نارسائی تا بکجا
رہ نہ جائے تیری بیداری میں کوئی اشتباہ

زندگی کا جلوۂ تکمیل آزادی میں ہے
فتح کر بڑھتے ہوئے طوفان آمیدائیں آ
دیکھ! تیری سمت ہے ناموسِ ہستی کی نگاہ

جمع کر خرمن، خیالِ برقِ خرمن چھوڑ دے
ہمنشیں، اُٹھ! رشتۂ اوہامِ باطل توڑ دے

علی اختر اختر

قبائے رنگیں

کاشانۂ فقیر پہ، اک شیخ روزگار
تشریف لائے اور بڑھا عز و افتخار
ہر لہجہ تھا حقیقتِ تجوید کا کفیل
ہر جملہ شانِ علم و تورع کا ذمہ دار
جب تک برنگِ خاص، گل افشانیاں رہیں
کرتا گیا قبول، اثر اور اقتدار
شامت سے اتنی بات مرے لب پہ آگئی
موجِ طرب، بڑھاتی ہے رنگینیٔ بہار
کچھ دیر چل کے باغ میں گلگشت کیجئے
قدرت کے راز پھولوں سے ہوتے ہیں آشکار
ہر پھول اگ رہے، ساغرِ بادہ بنا ہوا
ہر نونہالِ باغ ہے، مدہوش بادہ خوار
جوشِ غضب میں، ہاتھ عصا تک پہنچ گیا
پھر یوں خطاب تھا کہ سُن اے مردِ بے وقار
آئینِ اتباعِ شریعت سے دور ہے
سرمستیٔ بہار و تماشائے لالہ زار
اوراقِ دفترِ فقہا میں کہیں نہیں
ذکرِ جوازِ سیرِ گلستان و لالہ زار
مفہومِ دین ہے کہ عبادات کے سوا
جو وقت ہے، وہ لہو و لعب ہی میں ہے شمار

کچھ دن کے بعد پھر جو ملے شیخِ حق نگر
دھج ایسی جسکا عقل کو ہوتا نہ اعتبار
ریشِ سپید، رنگِ حنا کی رہینِ شکر
پیراہنِ دراز، صفائی میں جوئبار
رنگینیٔ قبا کی بھی اُس دن یہ شان تھی
گویا کہ قدِ سرو پہ ہے، عکسِ لالہ زار

کی عرض اگرچہ شوخ یہ طرزِ خطاب تھا
جائز کہاں ہے؟ مسلکِ رندانِ بادہ خوار؟
گلکاریٔ شباب سے بچنا تھا آپ کو
وہ کیا ہوا جناب کا دعوائے اعتذار؟

ہنس کر جنابِ شیخ کا ارشاد یہ ہوا
"باکس نگو کہ رازِ درون باشد آشکار"
دوشینہ در حبالۂ، عقدم نگار ست
در آمدہ، اشارت او بود بار بار
کاے ہوشمند، گوش کن و سوئے ما نگر!
دامن چنان سزد کہ گلِ تازہ بہار!!"

بسمل قاضی پوری

نالۂ سحری

مژہ پہ اشکِ وداعی نگاہ نیند بھری
افق پہ دیکھ رہا ہوں ستارۂ سحری

لباسِ ہستیٔ موہوم کے اڑا پرزے
وگرنہ کارِ عبث ہے یہ شغلِ جامہ دری

نگاہِ شوق کو پابندِ درسیات نہ کر
دلیلِ راہِ تجلی ہے کاوشِ نظری

مشاہدات کی دنیا کو چھاننے والے
تخیلات میں کر صرف قوتِ بصری،

نہاں ہیں سینکڑوں سورج حقیر ذروں میں
بلند کرکے ذرا دیکھ مطمحِ نظری!

ستارے ٹوٹ رہے ہیں سیاہ بختی کے
وہ آرہے ہیں ٹھہر جائے گردشِ قمری،

شفق ہے عکس مری خون شدہ تمنا کا
افق پہ نقش ہے تصویرِ نالۂ سحری،

لبِ خموش کو آمادۂ فغاں کردے
غذائے روح ہیں طالبؔ امینِ رہبری

طالب باغپتی

گریۂ بے اختیار

ستم رسیدۂ ہجراں کو خوب رونے دو
پڑے ہیں دامنِ دل پر جو داغ دھونے دو

اگر سرشکِ محبت نہیں ہیں بے حاصل
تو کشت کا ہے یہی وقت بیج بونے دو

خیالِ یار کو اشکوں کا ہار ہے مرغوب
اب احتیاط سے موتی مجھے پرونے دو

کسی کے لالۂ رخسار کے تصور میں
دل و جگر کو مرے گلفروش ہونے دو

کرو نہ مجھکو گرفتارِ صد عذابِ الیم
میں باز ہوش سے آیا حواس کھونے دو

گذر رہی ہے جو مجھ پہ نہیں جب اسکا علاج
تو کیا برا ہے کہ جو ہو رہا ہے ہونے دو

آمیں ہیں سخت پریشاں غریب ہمسائے
یہ شب کو نالے تو چھوڑو انھیں تو سونے دو

(امین حزیں)

رباعیات آسی

جب سے کہ پیا ہے جام عشرت میں نے
پائے ہیں سرور و عیش و راحت میں نے
جنت کی نہیں رہی تمنا باقی
دنیا کو بنا لیا ہے جنت میں نے

داماں ثباتِ عیش سیتا ہوں میں
ملتی ہے جہاں وہیں سے پیتا ہوں میں
یہ بھی معلوم ہے کہ مرنا ہے ضرور
یہ بھی مشہور ہے کہ جیتا ہوں میں

آزادیٔ دل کو بندِ غم میں نہ جکڑ
ناصح کی نہ مان بات رندوں سے نہ لڑ
دنیا ہے یہ سب ہوا ہی کرتا ہے یہاں
پینا ہے تو پی فضول جھگڑوں میں نہ پڑ

اک آرزوئے طرب چلی جاتی ہے
اک خواہش بے سبب چلی جاتی ہے
پینے کا نہیں ہے ہوش مستوں کو مگر
ساقی سے وہی طلب چلی جاتی ہے

گو روزِ سرور و خرمی ہے ساقی
فانی ہے خوشی تو کیا خوشی ہے ساقی
جس جام سے تو پلا رہا ہے مجھ کو
جانے کتنوں نے اس سے پی ہے ساقی

چشمے دودھ اور شہد کے بہتے ہیں
کھاتے پیتے ہیں جو وہاں رہتے ہیں
واعظ نے بتائی ہے یہ شانِ جنت
رندوں سے بھی پوچھ لو وہ کیا کہتے ہیں

میخانے میں لطف زیست پانے والے
مینا و سبو سے دل لگانے والے
پی لی ہے تو میکدہ کو خالی کر دے
باقی ہیں ابھی بہت سے آنے والے

غزلیات

(علی اختر اختر)

جو راز اب تک حجاب میں ہیں، وہ خود بخود آئینگے زباں پر
ادا تو کر سجدۂ عقیدت، نگارِ فطرت کے آستاں پر

قفس میں ہوں ہم صفیر! آزاد ہو تو اتنا قصہ خبر تو لینا
کہ بجلیاں رقص کر رہی تھیں ابھی ابھی میرے آشیاں پر

وہ رہروِ نامراد ہوں میں، جو راہ میں تھک کے رہ گیا ہو
شکستہ پائی کا غم ہے دل میں، نگاہ ہے گردِ کارواں پر

زمیں کی جانب بھی دیکھ، ناداں، کہ انجمستاں ہے ذرہ ذرہ
رہیگی تیری نگاہ، کب تک جمی ہوئی اوجِ آسماں پر

مجھے نہ دے طعنِ سطح بینی، نہ کھا فریبِ حیات، ہمدم
جہاں کے ہر شعبۂ عمل میں یقیں کی بنیاد ہے گماں پر

ترا یہ دعویٰ! رموزِ فطرت سے آشنا ہیں تری نگاہیں
پڑے ہوں تاریکیوں کے پردے جب اس قدر وسعتِ جہاں پر!!

زمانہ سر دُھن رہا ہے جس پر نمود ہے سطح کی وہ اختر
نہ جانے کیا ہو، جو روحِ شاعر کے بھید آجائیں زباں تک

(علی اختر۔ اختر)

کوئی کہاں تک سہے جفائیں، یہ بارِ غم کس طرح اٹھالے،
دُکھے ہوئے دل کی التجائیں، بجھی ہوئی روح کی دعالے

نہ چھیڑ، مطرب، ترانۂ غم کہ ہے ابھی تک تو رات باقی
ابھی سے اندیشۂ سحر کیا، سحر کا تارا تو مسکرا لے

میں اُس کی گہری نظر کے صدقے، جو رازِ ہستی سے باخبر ہو
میں اُس کے حسنِ ادا کے قرباں، جو زیست میں لذت غم بنا لے

رہے گا سازِ حجاب میں یوں، نہاں سرودِ جمال کب تک
کسی کا دستانِ عشق ہو جا، کسی کو خود ہمنشیں بنالے

رہینِ پندار ہوش! خاکِ رہِ خمستانِ عشق ہو جا
کہ طالبِ عیش سرمدی ہے تو روح کو خواب سے جگالے

حریمِ ہستی کا ذرہ ذرہ گواہ ہے، میرے سوزِ غم کا
یہ اولیں امتحانِ دل تھا، اب اور چاہے تو آزمالے

یہ جانگزا رنج نامرادی، کوئی کہاں تک اٹھائے اختر
میں اب تو یہ چاہتا ہوں دنیا سے مجھکو میرا خدا اٹھالے

(کوکب شاہجہانپوری)

جلوۂ شمعِ حرم زینتِ کاشانۂ دل یادِ ساقیٔ ازل قسمتِ پیمانۂ دل

اللہ اللہ اثرِ سوز و گدازِ اُلفت غیرتِ شمعِ دل افروز ہے پروانۂ دل

جو کسی سے بھی نہ اُٹھا تھا اُٹھایا وہ بار ہے وفا دارِ ازل ہمتِ مردانۂ دل

حسرتِ وصل و غمِ ہجر ــــ الٰہی توبہ میں مسلمان ہوا چھوڑ کے بتخانۂ دل

میں طلب گارِ مئے عشرتِ فانی؟ توبہ! بادۂ عشق سے معمور ہے غمخانۂ دل

مٹنے والوں سے ہوئی گرمیٔ بازار وہ چند غازۂ حسن ہے خاکسترِ پروانۂ دل

زندگی جوششِ تصور کی پرستش میں کٹی حسنِ فطرت کا مرقع ہے صنم خانۂ دل

مدتوں راز رہا رازِ محبت کوکب
اب تو ہر اشک پہ تحریر ہے افسانۂ دل

(ناطق گلاوٹھوی)

دولتِ دارین میرا مدعائے دل نہیں یہ مجھے کیا دے رہے ہو۔ میں کوئی سائل نہیں

کارِ ہمت جان و دنیا عشق میں ایدل نہیں زندگی مشکل ہے مرجانا تو کچھ مشکل نہیں

ڈھونڈتا ہے اے دلِ ناکام کس کا آسرا دیکھتا کیا ہے یہاں کوئی کسی قابل نہیں

کشتیٔ غم کو ہماری چھوڑ دے منجدھار میں ناخدا گرداب ہے مدِ نظر ساحل نہیں

شام سے گم کردہ راہی میں خدا جانے کہاں قافلہ آکر وہاں ٹھہرا جہاں منزل نہیں

رنجِ ناکامی نہ ہوجائے وبالِ زندگی یہ فضائے دل تو کچھ ہمت فزائے دل نہیں

دل وہ فرزانہ کہ اپنی بھی نہیں جسکو خبر میں وہ دیوانہ کہ اپنے کام سے غافل نہیں

وہ دلِ بے مدعا کی بات آتی ہے کہاں مدعا حاصل بھی ہوجائے تو کچھ حاصل نہیں

کیا کریں ذکرِ وفا جب ہو نہ دنیا میں وفا
حضرت ناطق ہم ایسی بات کے قائل نہیں

(نظیر لودیانوی)

میں بھولا نہیں ہوں وہ اگلے زمانے
وہ دل کش ترانے وہ رنگیں فسانے

گھٹاؤں سے ہر سو سیہ شامیانے
نواؤں سے معمور سب آشیانے

کہیں چاہِ کنعاں کہیں دشتِ ایمن
حصولِ سکوں کے ہزاروں بہانے

کبھی عاشقوں نے بھی ہمت نہ ہاری
لگائے بہت عشق نے تازیانے

پشیمان ہونے کا وقت آ رہا ہے
بلا شک نہ سمجھے بلا سے نہ مانے

زمانے کا ڈر کیا ہے مردانِ حق کو
کہ اُن کی بغل میں ہیں صد ہا زمانے

شجر بن کے افلاک پر چھا گئے ہیں
رہے کچھ دنوں خاکِ رہ میں جو دانے

مجھے صاف اے دل نظر آ رہا ہے
تری خاک میں ہیں جو مخفی خزانے

فضائے چمن کچھ بدل سی گئی ہے
نہ وہ لالہ و گل نہ وہ آشیانے

نظیر اب تو دل بھی وطن سے سوا ہے
کہ بستے ہیں اس میں کئی لودیانے

(افسر صدیقی امروہوی)

اُدھر جامِ عشرت کی سرشاریاں ہیں
اِدھر شامِ فرقت کی بیداریاں ہیں

تری چشمِ مخمور کا ہے تصور
نئے رنگ کی میری میخواریاں ہیں

دمِ نزع سے کیوں پریشان ہے دل
ابھی اور بھی چند دشواریاں ہیں

تری دلدہی کے طریقوں کو دیکھا
ستمگاریاں ہی ستمگاریاں ہیں

وفا پر ہے ثابت قدم دل ہمارا
قیامت کی تیری جفاکاریاں ہیں

کبھی کچھ تصور کبھی کچھ تصور
شبِ ہجر ہے اور بیداریاں ہیں

حقیقت مہ و مہر کی میں بتاؤں
ترے حسنِ رخ کی ضیاباریاں ہیں

تمتع زمانے سے آساں ہی افسر
مزاحم مگر میری خودداریاں ہیں

(حامد بھوپالی)

روح کا منزلِ ہستی سے جدا ہو جانا
قافلہ بھر کا ہے بے بانگِ درا ہو جانا

آؤ اک قصۂ افتادِ تمنا سن لو
پھر ہمیشہ کے لئے ہم سے خفا ہو جانا

یہ بھی اک مرحلۂ جوشِ بقا تھا اپنا
اہل دنیا جسے سمجھے ہیں فنا ہو جانا

اک نگاہِ کرمِ یار سکھا دیتی ہے
عمر بھر کے لئے پابندِ وفا ہو جانا

ہمپہ گذرا ہے محبت کا زمانہ حامد
ہمنے دیکھا ہے جفاؤں کا وفا ہو جانا

(خلیق فیض آبادی)

کہیں ایسا نہ ہو رونا پڑے الطافِ پنہاں کو
ارے او بے خبر! رسوا نہ کر چشم پشیماں کو

بہت ایسے ہیں جو اکتا گئے صحرا نوردی سے
مگر مجھ سے تو چھوڑا ہی نہیں جاتا بیاباں کو

نظر کے سامنے گویا کوئی ہر وقت رہتا ہے
محبت کے مزے آتے ہیں مجھ محروم ارماں کو

بہار آئے نہ آئے میں کروں کیوں انتظار اس کا
تمہارا نام لیکر چاک کرتا ہوں گریباں کو

بھرے آتے ہیں کیوں آنکھوں میں آنسو کیا کہوں ہمدم
ابھی دیکھا تھا کچھ نقش و نگارِ طاقِ نسیاں کو

خلیق بادفا کی یاد آئی رو دیا ظالم
جہاں چھیڑا کسی نے داستانِ شامِ ہجراں کو

(اثر لکھنوی)

چارۂ درد سے جاں اور دگرگوں ہوتا
کہ اگر داغ نہ ہوتا تو یہ دل خوں ہوتا

کوندتی پیشِ نظر برق تجلائے جمال
اور کچھ ولولۂ شوق جو افزوں ہوتا

چشم حیراں بھی ملی ذوق تماشا جو ملا
اور کیو نکر ترا چاہا دل مفتوں ہوتا

عمر بھر ایک اسی نے تو مرا ساتھ دیا
کیوں نہ برگشتگئ بخت کا ممنوں ہوتا

چشم مخمور کا جادو بھی چلا ساتھ اثر
کس طرح کوئی حریف لب میگوں ہوتا

مولانا شبلی

سیرۃ النبی جلد اول عہ
″ دوم عہ
″ سوم معہ
الفاروق عا و ے
سیرۃ النعمان عہ
الغزالی عہ
المامون عہ
سوانح مولانا روم عہ
سفرنامہ مصر و شام عہ و عا
علم الکلام عہ و عا
~~الکلام عہ و عا~~
رسائل شبلی عہ
مقالات شبلی عہ
شعر العجم جلد اول ۱۲ر
″ دوم ۸ر
″ سوم ۸ر
″ چہارم ۸ر
″ پنجم ۱۲ر
موازنۂ انیس و دبیر ے
مضامین عالمگیر عہ و ۱۲ر
آغاز اسلام ۱۲ر و عہ
کلیات فارسی شبلی عا
کلام شبلی اردو عہ و ۸ر

رتن ناتھ سرشار

سیر کہسار ے
خدائی فوجدار عہ
جام سرشار عا
الف لیلہ بطرز ناول عہ
کامنی عہ

سوانح عمر و عیار عہ

منشی سجاد حسین مرحوم

احمق الذی ۸ر
حاجی بغلول ۸ر
پیاری دنیا ۸ر
کایا پلٹ ۸ر
میٹھی چھری ۶ر
طرحدار لونڈی عہ
طلسمی فانوس ۱۲ر

جوالا پرشاد برق

مرنالنی ۱۰ر
مار آستین ۱۰ر
بنگالی دولہن ۱۲ر
معشوقۂ فرنگ ۸ر
پرتاب ۱۲ر
روہنی ۱۰ر

مولانا شرر مرحوم

جنید بغدادی عہ
ملکۂ زنوبیہ ۳ر
قرۃ العین ۳ر
مخدرات ۸ر
جویائے حق للعہ
لعبت چین عہ
فاتح و مفتوح عہ
بابک خرمی ۸ر
الفانسو ۱۲ر
ایام عرب ۸ر
قیس و لبنیٰ عہ
یوسف و نجمہ ۸ر
زوال بغداد عہ

مینا بازار عہ
مقدس نازنین ۸ر
رومۃ الکبریٰ عہ
فلپانا ۸ر
شوقین ملکہ ۸ر
منصور موہنا ۸ر
حسن انجلینا ۸ر
ملک العزیز ورجنا ۱۲ر
فردوس بریں ۸ر
حسن کا ڈاکو ۸ر
دربار حرام پور ۱۰ر
غیب دان دلہن عہ
بدر النسا کی مصیبت ۴ر
میوۂ تلخ ۸ر
نیکی کا پھل عہ

شوق قدوائی

ترانۂ شوق عہ
قاسم و زہرہ ۱۲ر و عہ
نیرنگ جمال ۴ر

ظفر عمر بی اے

چوروں کا کلب ۹ر
نیلی چھتری عہ
بہرام کی گرفتاری عہ

دلچسپ تاریخی و جاسوسی ناول

شعلۂ رنگین ۸ر
محاصرۂ پیرس عہ
شیخ چلی عہ
بہرام کی واپسی ۴ر
انقلاب فرانس عہ
حسن بنارس ۸ر

فطرتی جاسوس عہ
ٹرکی حرم سرا ۸ر
جنگ طرابلس ۸ر
بہرام چور عہ
زر پرست عہ
گنجی کا راز عہ
عبدالرحمن ناصر عا
عروس مصر عا
سیلاب خون عہ
سیاحت زمین عہ
سیاحت ہوا عہ
نازنین مراکش ۸ر
سمندر کی سیر عا
اسرار بالشویزم عہ
رنج لیلی ے
ایپن بک عہ
حجاج بن یوسف عہ
یوسف پاشا عہ
انقلاب عثمانی عہ
بہرام کی رہائی عہ
بہرام کی آزادی ۱۲ر
بہرام کی سرگذشت عہ
لال کھجور عہ
پراسرار قتل عا

ادبی کتابیں

مکمل شرح دیوان غالب ے
بزم خیال عہ
نشاط سخن عہ
انتشار نسواں ۶ر
مکاتیب محسن الملک عہ

لیلی مجنوں ڈراما ۸ر

مراثی

مراثی دبیر عا
مراثی انیس للعہ
مراثی ضمیر عہ
مراثی مونس ۱۲ر
مراثی دلگیر ۱۲ر

تذکرۃ الشعراء

تذکرۂ حسینی ۱۱ر
گلشن ۱۰ر
سراپائے سخن عہ
سوانح نظیر اکبرآبادی عا

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز عہ
کلیات عراقی ۱۲ر
دیوان حافظ عہ
دیوان بیدل عہ
دیوان عرفی ۱۲ر
کلیات جامی عہ
کلیات غالب عہ
کلیات صائب عہ
دیوان ناصر علی ۶ر
کلیات سعدی عہ
کلیات حزیں عا
دیوان عنصری ۱۴ر
دیوان غنی کشمیری ۶ر
دیوان ہلالی ۶ر

دواوین اردو

کلیات ظفر عا
کلیات مومن عہ

دیوان ناسخ عہ
کلیات میر عہ
کلیات سودا عہ
کلیات انشا عہ
کلیات نظیر اکبرآبادی عہ
گلزار داغ عہ
دیوان رند ۹ر
دیوان ذوق ۱۲ر
کلیات اسمٰعیل عا
مرآۃ الغیب عہ
صنمخانۂ عشق عا
فریاد داغ ۴ر
دیوان قائم ۸ر
دیوان شہیدی ۴ر

عجائب و غرائب

عجائب المخلوقات
تصویر رنگین ے
″ باتصویر سادہ للعہ
مجمع الفنون ے
طلسم فرنگ عا
کارخانۂ عالم عہ

رنالڈز کے ناولوں کے ترجمے

الہ دین دہلی ۱۲ر
فریب حسن عا
سوزان عشق عہ
روزا لیمبرٹ للعہ
ناول اسرار عا
شام جوانی ے
طلسمی فانوس ۱۲ر

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

ذیل کی کتابیں نگار بک ایجنسی سے طلب فرمائیے

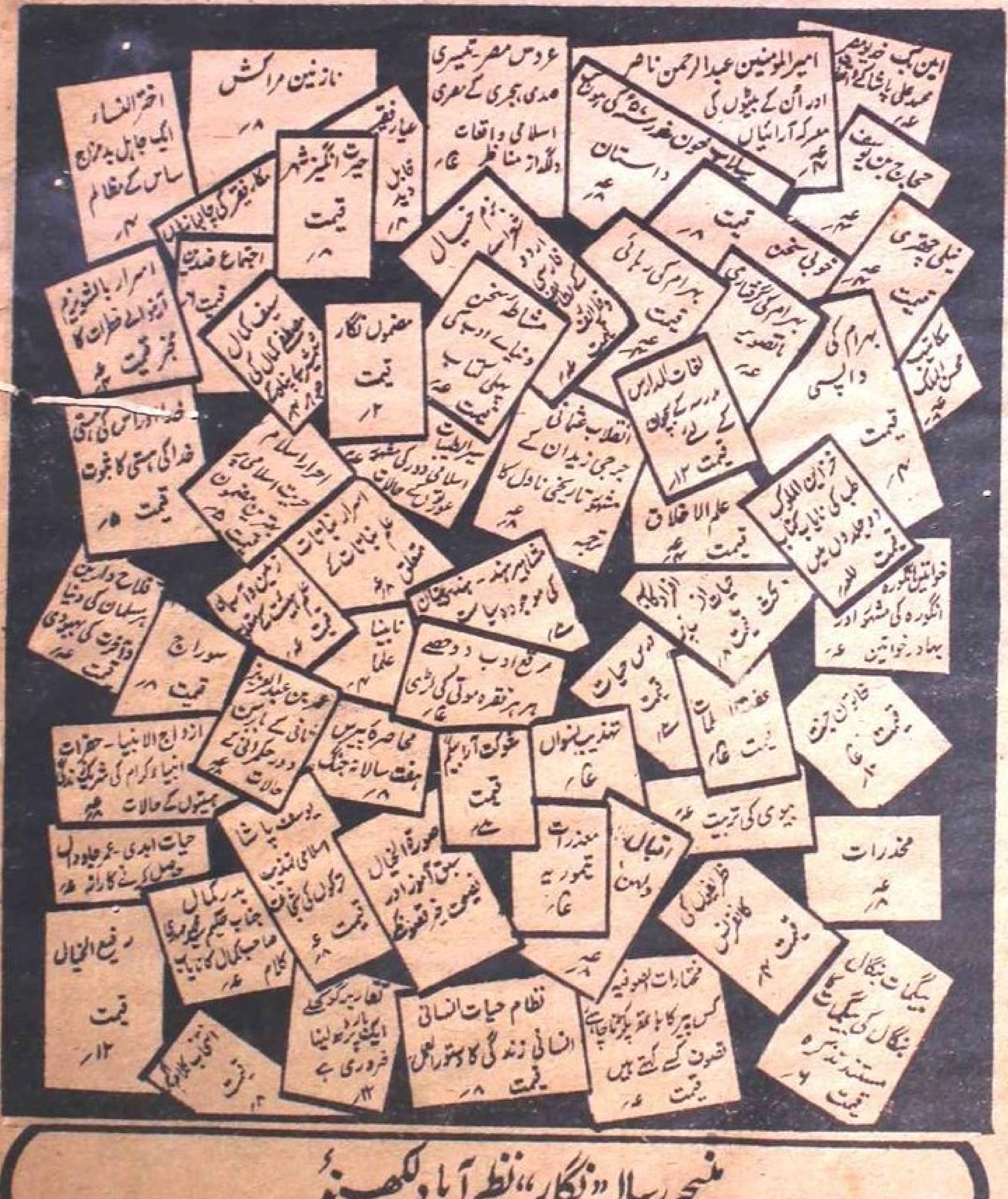

منیجر رسالہ "نگار" نظیر آباد لکھنؤ